عليكم انفسكم لا يضركم من ضل اذا اهتديتم

طلوعِ اسلام

ایک ملی اسلامی مجلہ

جولائی ۱۹۴۸

ایک روپیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام
کراچی

دورِ ثانی

مرتب
محمد یونس

بدلِ اشتراک

سالانہ	دس روپے
ششماہی	چھ روپے
قیمت فی پرچہ	ایک روپیہ

جلد ۱ نمبر ۷

فہرست

لمعات ۲
اسلامی نظام ۱۷
(جناب پرویز)
پیرو مسلم ۴۹
(علامہ اسلم جیراجپوری)
قرآن اور شاعری ۵۹
(جناب پرویز)
داغہائے سینہ ۷۵
(متحول جامعہ من جناب فضل الٰہی صاحب مد ظلہم)
نصر من اللہ (جناب اسلم ملتانی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لمعات

ہندوؤں نے، سومنات کی جامع مسجد کو، جسے ۱۰۲۳ء میں سلطان محمود غزنوی نے تعمیر کرایا تھا زبردستی مندر میں تبدیل کر لیا ہے۔ اس موقعہ پر ہندوؤں نے بہت بڑا جشن منایا جس میں پولیس اور فوج نے بھی شرکت کی۔ مسجد کے ۰۰ سالہ بوڑھے متولی کو باہر نکال دیا گیا۔ اور خدا کے اس گھر میں بُت رکھدیئے گئے۔ اب مسجد میں ناقوس بجتا ہے اور بتوں کی پوجا ہوتی ہے۔ (کوآن ۲۰ جون ۱۹۴۸ء)

یہ ایک مثال ہے استبداد و قہرمانیت کی، ان سینکڑوں مثالوں میں سے جو ہندوستان کی مزعومہ جمہوری حکومت، باایں ہمہ ادعائے حریت فکر و نظر اور آزادی مذہب و مسلک، ہندوستان کے چار کروڑ مسلمانوں پر بلا دریغ و بے محابا روا رکھ رہی ہے۔ ایک مساجد و معابد کا کیا ذکر۔ کونسی شے ہے جو مسلمانوں کے نزدیک محبوب و محترم ہے اور اسے وہاں محفوظ و مصئون سمجھا جا سکتا ہے۔ جان، مال، عزت، آبرو، عصمت، ناموس، سب ان کے رحم و کرم پر ہے۔ جنہیں

خبر نہیں روش بندہ پروری کیا ہے؟

یہی وہ "فساد ملوکیت" ہے جس کی طرف قرآن کریم نے ان بلیغ الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے کہ ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا وجعلوا اعزۃ اھلھا اذلۃ وکذالک یفعلون (۳۴ـ۲۷)۔ جب کسی ایسی قوم کو حکومت مل جاتی ہے جو نشۂ ملوکیت سے بدمست ہو تو وہ عدل و انصاف کی تمام راہوں کو الٹ دیتی ہے۔ اور عزت و شرافت کے پیکروں کو ذلیل و خوار کرنے میں لذت لیتی ہے وکذالک یفعلون۔ یعنی یہ کسی ہنگامی واقعہ کی طرف اشارہ نہیں جو ازمنۂ قدیمہ میں کبھی گزر چکا ہو۔ بلکہ یہ خاصۂ ملوکیت ہے۔ یہ قوت بے زمام کی فطرت ہے۔ ملوکیت ہمیشہ یہی کرتی چلی آئی ہے اور یہی کرتی چلی جائے گی۔ وکذالک یفعلون۔ اور جب حکومت و سطوت کسی ایسی قوم کو مل جائے جو ہمیشہ غلام رہی ہو تو تنگ ظرفی اور تنگ نگہی، جور و استبداد کے خنجر بریاں کے ساتھ بد ظرفی اور سفلگی کی جراحت پنہاں بھی شامل کر دیتی ہے اور ان کی پیاس خون آشامی اور انتقام جوئی سسک سسک کر مرنے والوں کا تماشا دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ مصیبت عظمیٰ اور نائبہ کبریٰ جس میں آج ہندوستان کا مسلمان گرفتار ہے۔

وہ مسلمان جو تقسیم ہند کی مخالفت کیا کرتے تھے اس چیز کو اپنے مسلک کے حق بجانب ہونے کے لئے بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ اور خوش ہیں کہ انہیں یہ دلیل مل گئی۔ بعض سادہ لوح مسلمان ان کی اس مگر فریب دلیل سے متاثر بھی ہو جاتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں کہ تقسیم ہند یا تشکیل پاکستان، فی الواقعہ ایک غلط قدم تھا۔ لیکن سوچئے کہ کیا حقیقت یہی ہے!

تقسیم ہند سے پہلے، جن جن امور میں ہندوؤں کو دستِ غالب حاصل تھا، ذرا غور کیجئے کہ ان میں مسلمانوں کے ساتھ کیا گذرا کرتی تھی؟ ملازمت، تجارت، صنعت و حرفت، یا اس سے آگے بڑھئے تو لوکل باڈیز یا ڈسٹرکٹ بورڈ۔ اور آگے بڑھئے تو ہندو فرمانرواؤں کی ریاستیں۔ ذرا سوچئے کہ ان تمام شعبوں اور دائروں میں مسلمانوں کا کس قدر حصہ ہوا کرتا تھا۔ اور ابھی وہاں انگریز کا راج تھا۔ یہ غلط ہے کہ تقسیم ہند کے بعد چونکہ وہاں مسلمانوں کی تعداد نسبتاً کم رہ گئی ہے اس لئے ہندو دلیر ہو گیا ہے۔ تعداد کا سوال ہی نہیں۔ کیا نو دس کروڑ اور کیا چار یا پانچ کروڑ۔ یہ بہرحال اقلیت میں تھے۔ اصل چیز ہندو کی ذہنیت ہے۔ انگریز کے راج میں وہ دبے پاؤں چلا کرتی تھی۔ اب کھلے بندوں سامنے آ گئی ہے۔ اگر مسلمان دس کروڑ بھی ہوتے تو بھی ہندو کی خوئے مخاصمت و معاندت میں کوئی فرق نہ آتا۔ آج بھی دیکھئے مثلاً یو۔پی، بہار، بمبئی وغیرہ میں قریب قریب اتنے ہی مسلمان ہیں جتنے تقسیم ہند سے پہلے تھے۔ لیکن ان کی یہ تعداد ہندوؤں کی چیرہ دستیوں اور ستم کوشیوں پر ذرا بھی اثر انداز نہیں ہوئی۔ اس لئے یہ کہنا سر تا سر ابلہ فریبی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر جو کچھ بیت رہی ہے اس کی ذمہ دار تقسیم ہند ہے۔

اب دوسری طرف آیئے۔ اگر ہندوستان کی تقسیم نہ ہوتی تو دس کروڑ مسلمانوں پر وہی کچھ ہوتا جو آج وہاں چار کروڑ مسلمانوں پر ہو رہا ہے۔ اس تقسیم سے کم از کم پانچ چھ کروڑ مسلمان تو ان کی دراز دستیوں اور تطاول انگیزیوں سے بچ گئے۔ صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ ان کی دراز دستیوں سے بچ گئے۔ بلکہ رزق اور قوت کے ان تمام سرچشموں کے مالک بن گئے جو اس سے پہلے ہندوؤں کی واحد اجارہ داری میں تھے۔ پاکستانی علاقہ کی تمام، تجارت صنعت و حرفت۔ کاروبار، ذرائع پیداوار اور اسباب مواصلات، سب کے سب مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں۔ کیا مشترکہ ہند میں کوئی مسلمان اس کا خواب بھی دیکھ سکتا تھا؟ اس وقت مسلمان کے حصہ میں حمالی تھی یا بقالی۔ وہاں کوئی میدان ایسا نہ تھا جس میں مسلمان ہندو کا مقابلہ کر سکتا۔ اب یہاں کوئی میدان ایسا نہیں جس میں اس کے راستہ میں ہندو حائل ہو۔ کیا یہ خدا کا کم انعام ہے وَاَوْرَثَکُمْ اَرْضَہُمْ وَدِیَارَہُمْ وَاَمْوَالَہُمْ ... وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا (۳۳/۲۷)، کہ اس نے تمہیں ان کی زمینوں کا اور شہروں کا اور مال و متاع کا مالک بنا دیا۔ اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

جو لوگ آج یہ کہتے ہیں کہ تقسیم ہند سے تمام مصیبتیں آ گئیں۔ یاد رکھو! وہ تمہارے بدترین دشمن ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا یہ انعام تم سے چھن جائے اور تم پھر انہی تنگ نظر، گوسالہ پرست، ہندوؤں کے غلام بن جاؤ۔ وَاللّٰہُ یَکُوْنُ عَلٰی وَجْہٍ بِیْنٍ ہندوستان کے مظلوم و مقہور مسلمانوں کے مصائب و نوائب کا یہ حل نہیں کہ چھ کروڑ آزاد مسلمان بھی ان کے ساتھ جا ملیں اور انہی مصیبتوں میں مبتلا ہو جائیں۔ اگر آپ کا ایک بھائی جیل خانہ میں ہے تو کیا اس کی مشکلات کا مداوا اس سے ہوتا ہے کہ آپ بھی اس کے ساتھ جیل خانے کی کوٹھڑی میں بند ہو جائیں۔ حل اس کا کچھ اور ہوتا ہے۔

ذرا سوچئے کہ ہندو آج اس قدر اوچھا کیوں ہو رہا ہے؟ جو کچھ اس نے مشرقی پنجاب، دہلی، الور، گوالیار وغیرہ کے مسلمانوں کے ساتھ کیا۔ جو روش اس نے جونا گڑھ، کشمیر اور آج حیدرآباد کے معاملہ میں اختیار کر رکھی ہے۔ اور جن مشئومہ عزائم کی بعض جھلکیاں ان کے اکابرین کے جوشِ غیظ و غضب میں ان کی کف دہانی کے ساتھ دنیا کے سامنے آ جاتی ہیں۔ اس کا اصل سبب کیا ہے؟ آپ غور سے دیکھیں گے تو ان تمام بے انصافیوں اور دست درازیوں کی علت یہ نظر آئے گی کہ ہندوؤں نے یہ خیال کر لیا ہے کہ پاکستان کا مسلمان کمزور ہو چکا ہے۔ بس یہ ایک وہم ہے جس

ہیں ہندوؤں کے اس تمام اوچھے پن کا راز پوشیدہ ہے۔ کم ظرف انسان جب یہ یقین کرلے کہ اس کا فریق مقابل کمزور ہے تو اس کی دناءت وسفالت انتہائی سفاکی اور قصائی میں ڈھل جایا کرتی ہے۔ یہ ایک محکم اصول ہے جس کا جس جگہ چاہے مطالعہ کر لیجئے۔ یہی اصول آج ہندو کی پیہم ظلم خیزیوں کی تہہ میں کار فرما ہے۔ مغربی پنجاب میں ہندوؤں کے ہاں ایک مثل تھی کہ "مُسلے نوں ڈرائیے۔ ڈر جائے تے ڈر جائے۔ نئیں تے آپ ڈر جائیے"۔ مسلمان کو گیدڑ بھبکی دو اگر وہ اس کے رعب میں آجائے تو خوب۔ ورنہ خود دب جائیے۔ آج ہندوستان کا ہندو، اپنی قوت کے نشہ کے زعم باطل میں مسلمانوں کو اسی قسم کی بھبکیاں دے رہا ہے۔ اگر مسلمان نے اپنے دل میں سمجھ لیا ہے کہ وہ واقعی کمزور ہو چکا ہے تو ہندوؤں کی بھبکیاں فی الواقعہ کارگر ہو جائیں گی۔ اور اگر اس کا اس پر ایمان ہے کہ

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم!

تو یقین مانئے۔ ہندو اس ضیغم خیشلق کی ایک دھاڑ کو بھی برداشت نہیں کر سکے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ آج مصائب زندگی میں سپاہ اور اسلحہ بڑی چیز ہے لیکن یاد رکھئے! قوموں کی قوت کا راز ان کی سپاہ اور اسلحہ کی فراوانی میں نہیں ہوتا۔ یہ راز ان کے عزم وثبات اور ایمان ویقین میں پنہاں ہوتا ہے۔ یقین کی قوت، دنیا کی ہر قوت پر غالب ہوتی ہے۔ یہی وہ قوت ہے جس کی بنا پر تاریخ کی --- آنکھوں نے یہ تماشے بھی دیکھے ہیں کہ کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة ... باذن اللہ کتنی ہی چھوٹی چھوٹی جماعتیں تھیں جو بڑی بڑی جماعتوں پر اللہ کے قانون کے ماتحت غالب آگئیں۔ وہ قانون خداوندی کیا ہے؟ وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (۲/۲۴۹) یعنی کہ اللہ کی نصرت عزم وثبات کا ساتھ دیتی ہے۔ یقین کی قوتیں مادی قوتوں کی کمی کو بھی پورا کر دیتی ہے۔

مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی!

اگر اس پر شہادت کی ضرورت ہے تو پوچھئے بدر وحنین کے ذرات سے جنہوں نے مومنین کو بے تیغ لڑتے اور فاتح ومنصور لوٹتے دیکھا ہے۔ یقین کی قوت، فریق مقابل کے سپاہ واسلحہ کو تو خاطر میں نہیں لاتی ان کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

الذین قال لہم الناس ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوہم فزادہم ایمانا

وقالوا حسبنا اللہ ونعم الوکیل (۳/۱۷۳)

یہ وہ لوگ ہیں جن سے بعض آدمی کہتے تھے کہ تم سے جنگ کرنے کے لئے دشمن نے بہت بڑا لشکر اکٹھا کر رکھا ہے۔ سو تم ان سے ڈرو اور مقابلے کے لئے نہ نکلو۔ لیکن یہ بات سن کر بجائے اس کے کہ وہ ڈر جاتے، ان کا ایمان اور مضبوط ہو گیا۔ اور وہ بے خوف وخطر پکار اٹھے کہ ہمارے لئے اللہ کا سہارا بس کرتا ہے۔ اور جس کا کارساز اللہ ہو تو کیا ہی اچھا اس کا سہارا ہے۔

اور اس کا نتیجہ۔

فانقلبوا بنعمة من اللہ وفضل لم یمسسہم سوء واتبعوا رضوان اللہ

یہ لوگ مقابلے کے لئے نکلے اور اللہ کی نعمت اور فضل سے شادکام واپس لوٹے۔ کوئی گزند انہیں چھو نہ سکا۔ اور وہ اللہ کی خوشنودی کی راہ میں گامزن رہے۔

مسلمان کسی پر زیادتی نہیں کرسکتا۔ وہ خواہ مخواہ جنگ کی آگ کو مشتعل نہیں کرتا۔ وہ دنیا میں امن و سلامتی چاہتا ہے۔ لیکن وہ کسی اور کو بھی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ امن کو خراب کرے اور خدا کی مخلوق کو ستائے۔ ہندوؤں نے گذشتہ دس ماہ کے عرصہ میں دنیا پر روشن کر دیا ہے کہ وہ کس قدر امن و سلامتی کا دشمن اور ظلم و فساد کا رسیا ہے۔ اور اس کی علت جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے، صرف یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ پاکستان کا مسلمان کمزور ہے۔ لہٰذا ہندو کے دماغی خلل کا علاج یہ ہے کہ اس کے دل سے یہ زعم باطل نکال دیا جائے کہ مسلمان کمزور ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ مسلمان اس کا عزم کر لے کہ جو آنکھ ان کی طرف بھی بری نیت سے دیکھے گی وہ آنکھ نکال لی جائے گی۔ خواہ وہ کسی سر میں کیوں نہ ہو۔ اگر ہندوؤں نے کسی سمت سے بھی اپنے قدم بڑھائے تو مسلمانوں کی طرف سے اس کا جواب وہی ہونا چاہیئے جو ابدالی کی تلواروں نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو دیا تھا۔ یاد رکھئے! اگر ہندو کو ایک شکست مل گئی تو پھر یہ خود بھی امن سے رہے گا اور دنیا کا امن بھی بحال ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد ہندوستان کے چار کروڑ مسلمان بھی عزت و آبرو کی زندگی بسر کر سکیں گے۔ پھر سُن رکھئے! کہ اس کے لئے فوج اور اسلحہ پر ہی بھروسہ کئے نہ بیٹھے رہیے۔ جب تک پوری کی پوری قوم عزم و ثبات سے مقابلہ نہ کرے۔ فوج اور اسلحہ کچھ نہیں کرسکتا۔ پاکستان کی قوت کا راز مسلمانوں کے عزم و ثبات میں ہے۔ جو تمہیں یہ کہتا ہے کہ تم کمزور ہو، وہ ملت کا بدترین دشمن ہے انما ذٰلکم الشیطٰن یخوف اولیاءہٗ فلا تخافوھم وخافون ان کنتم مؤمنین ٥ (۳/۱۷۴) "یہ شیطان ہے جو تمہیں اپنے ساتھیوں سے ڈرانا چاہتا ہے۔ اگر تم ایمان رکھتے ہو تو شیطان کے ساتھیوں سے نہ ڈرو۔ اللہ سے ڈرو" تمہیں سالِ گذشتہ کی قیامت صغریٰ سے اس حقیقت کا خود تجربہ ہو چکا ہے کہ مرتا وہ ہے جو موت سے بھاگتا ہے۔ جو موت کے سامنے اکڑ جاتا ہے موت اس سے خود خوف کھاتی ہے۔

یہ درست ہے کہ ہمارے اکابرین ہماری ان توقعات پر پورے نہیں اترے جو ہم نے اُن سے وابستہ کی تھیں یہ بھی ٹھیک ہے کہ ہماری حکومت کی مشینری میں بہت سے نقائص ہیں۔ لیکن یہ چیزیں قطعاً اس کا جواز نہیں بن سکتیں کہ آپ پاکستان کے استحکام کی طرف سے بے فکر ہو جائیں۔ پاکستان، تمام ملت اسلامیہ کی مشترکہ امانت ہے۔ ہمارے اکابر صاحبان اس امانت کے واحد مالک نہیں کہ اس کے ضائع ہونے میں صرف ان ہی کا نقصان ہوگا۔ ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ یہ تو وہ آگ ہوگی جس کے شعلوں سے نہ اکابر ہی بچ سکیں گے نہ عوام واتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ ج واعلموا ان اللہ شدید العقاب (۸/۲۵) "اس عظیم فتنہ سے اپنا بچاؤ کرو جو صرف ان ہی تک محدود نہیں رہے گا جو تم میں سے زیادتی کرنے والے ہیں۔ یاد رکھو۔ اللہ کا قانونِ مکافات بڑا سخت گیر ہے" لہٰذا اپنے کارکنانِ حکومت کی خامکاریوں کی طرف نہ جاؤ۔ ان بدنظمیوں کی وجہ سے پیدا شدہ پریشان حالیوں کی طرف نہ جاؤ۔ اپنے سامنے پاکستان کا استحکام رکھو کہ پاکستان کی بقا خود تمہاری اپنی بقا ہے۔

غیر ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے۔

موجودہ فنونِ جنگ میں دشمن کا سب سے بڑا حربہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فریقِ مقابل میں خوف و ہراس

پھیلا دیتا ہے۔ تاکہ ان میں انتشار و اختلال پیدا ہو جائے۔ امن کے زمانہ میں اس قسم کی وحشت انگیزی اور دہشت افشانی سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ قوم مخالف کے عزم و ثبات کا جائزہ لیا جائے۔ (گذشتہ ایام ۱۵ جون کا ہوا اسی قسم کا مقیاس (۱۹۴۸ء) تھا جو مسلمانان پنجاب کی ہمت آزمائی اور حوصلہ پیمائی کے لئے ہندؤں کی طرف سے فضا میں پھینکا گیا تھا)۔ اس تخویف و ترہیب کا جواب جمعیت خاطر اور سکون دماغ ہے۔ اگر ہم نے اس قسم کی وحشت انگیز خبروں کو سن کر بھاگنا شروع کر دیا تو یاد رکھئے یہ خواہ مخواہ دشمن کو حملہ کی دعوت دینا ہے۔

جب کبھی اس قسم کی وحشت انگیز افواہیں پھیلیں ان کے پیچھے یونہی نہیں لگ جانا چاہیئے بلکہ ان کی تحقیق کر لینی چاہیئے۔ ان جاءکم فاسق بنبا فتبینوا ان تصیبوا قوما بجہالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین (۴۹/۶)۔ "جب کوئی فتنہ جو تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو ہمیشہ اس خبر کی تحقیق کر لیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ بے خبری میں تم قوم کو نقصان پہنچا دو اور پھر اپنے کئے پر نادم ہونا پڑے۔ خبروں کی تحقیق بھی انفرادی طور پر نہیں ہونی چاہیئے۔ بلکہ ایسے امور کیلئے حکومت کی طرف مراجعت کرنی چاہیئے۔ سورہ نساء میں ہے۔

وَاِذَا جَآءَھُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِہٖ وَلَوْ رَدُّوْہُ اِلَی الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓی اُولِی الْاَمْرِ مِنْھُمْ لَعَلِمَہُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَہٗ مِنْھُمْ (۴/۸۳)۔

جب کوئی امن یا خوف کی بات ان تک پہنچتی ہے تو یہ اسے خوب پھیلاتے ہیں۔ وہ اگر ایسی خبر کو رسول کی طرف یا ان لوگوں کی طرف جو ان میں صاحب اختیار ہیں، لوٹاتے تو جو ان میں بات کی تہ تک پہنچتے ہیں وہ اس کی حقیقت کی پرکھ کر لیتے

لہٰذا جب کبھی کوئی ایسی خبر پھیلے تو اسے ارباب حکومت کی طرف منتقل کر دینا چاہیئے تاکہ وہ اس کی تحقیق کر لیں۔ اور اگر یہ خبر صحیح نکلے تو پھر تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اس مقصد وحید کے لئے آہنی دیوار کی طرح جم کر کھڑے ہو جاؤ۔ اور کوئی حرکت ایسی نہ کرو جس سے تمہاری ہوا اکھڑ جائے۔ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم (۸/۴۶)۔ آپس میں ایک دوسرے سے جھگڑا مت کرو ورنہ تم پست ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی واصبروا (ایضاً)۔ ثابت قدم رہو کہ ان اللہ مع الصابرین۔ اللہ کی نصرت ثبات و استقلال سے مشروط ہوتی ہے۔ اور پھر جب دشمن کا مقابلہ ہو تو فاثبتوا واذکروا اللہ کثیرا لعلکم تفلحون ۰ (۸/۴۵) قدم جما کر سامنے آ جاؤ اور ہر وقت اللہ کی نصرت کو سامنے رکھو اور اس کی یاد دل میں۔ یہی کامیابی کا راز ہے ولا تولوھم الادبار (۸/۱۵)۔ دشمن کو پیٹھ دکھا کر بھاگ کھڑے ہو۔ یاد رکھو۔ اگر تم کسی ایسے وقت پھر اسی طرح بھاگ اٹھے جس طرح پچھلے سال مشرقی پنجاب، فیروز پور میں تم نے کیا تھا۔ تو جس بے عزتی اور بے حرمتی سے وہاں سے نکالے گئے تھے (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) اس سے بدتر حالت میں یہاں سے نکالے جاؤ گے۔ اور سچ پوچھئے تو اب تو کہیں نکل بھاگنے کا راستہ ہی نہیں۔

اس لئے اب عزم و ثبات سے کھڑے ہونا سیکھو۔ اللہ کی موہبت نے تمہیں بڑی فراواں قوتوں کا مالک بنا دیا ہے۔ مسلمان جیسا سپاہی دنیا کی کوئی اور قوم پیدا نہیں کر سکی۔ پاکستان کے ذرائع پیدائش اتنے وسیع ہیں کہ ساری دنیا تمہاری محتاج ہوگی۔ اور تم دنیا میں کسی کے محتاج نہیں ہو گے۔ آج بھی دنیا کے بازار بیع و شریٰ میں تمہاری

سا کو بہت بڑی ہے۔ تم جم کر کھڑے ہو گئے تو اس ستون کے سہارے پورے عالم اسلامی کی عمارت کھڑی ہو جائے گی۔ کیا تم نے اس بچے کی بات نہیں سنی جو کوفہ کے بازار میں جا رہا تھا۔ بارش سے بازار میں کیچڑ ہو رہی تھی اور بچہ تیزی سے چل رہا تھا۔ پیچھے پیچھے امام اعظمؒ آ رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ بیٹا! سنبھل کر چلو۔ پاؤں پھسلا تو گر جاؤ گے۔ بچے نے مڑ کر دیکھا تو عرض کیا! حضور! میری فکر نہ کیجئے۔ اپنا پاؤں سنبھالئے۔ میں پھسلا تو تنہا میں ہی گروں گا۔ اگر خدانخواستہ آپ پھسل گئے تو سارا عالم اسلامی نیچے آ گریگا۔ پاکستان کے مسلمانو! عالم اسلامی میں آج تمہارا مقام، مقام اعظم ہے۔ تمہارے سنبھلنے سے عالم اسلامی سنبھل جائیگا۔ اور تمہارے پھسلنے سے ساری اسلامی دنیا پھسل جائے گی۔ صرف اسلامی دنیا ہی نہیں بلکہ اس سے بھی کچھ آگے۔ یہ خطۂ ارض، قرآنی نظام کے احیاء و ترویج کی تجربہ گاہ بننے کے لئے تمہیں دیا گیا ہے۔ سوچو کہ اگر تم نے ہمت ہار دی تو نوعِ انسانی خدا کی کتنی عظیم القدر نعمتوں سے محروم رہ جائے گی اور پھر ان کی تمام غلط کاریوں کی ذمہ داری کس پر عائد ہو گی!

بے خبر تو جوہر آئینۂ ایام ہے
تو زمانہ میں خدا کا آخری پیغام ہے

اللہ نے تمہیں نوعِ انسانی کی امامت کے لئے منتخب کیا ہے اجتبار واصطفار کا یہ مقام ہر کسی کے حصہ میں نہیں آتا۔ واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اللہ کے انعامات واحسانات کو سامنے رکھو اور پھر سوچو کہ تمہارا طرزِ زندگی اور نصب العین کیا ہونا چاہیئے۔ اللہ تمہیں اس مقام بلند پر لیجانا چاہتا ہے لیکن اگر تم ان ہندوؤں کے سامنے جھک گئے جو خود پتھروں اور حیوانوں کے سامنے جھکتے ہیں۔ تو سمجھ لو کہ دنیائے انسانیت میں یہ کتنی بڑی گراوٹ ہو گی۔ حکومت جو کچھ اس ضمن میں کر رہی ہے کرنے دو۔ لیکن تم خود اپنے اپنے طور پر، اپنی اپنی جگہ منظم ہو جاؤ گاؤں گاؤں، قریہ قریہ، شہر شہر، محلہ محلہ۔ اپنی تنظیم کرتے جاؤ۔ بس ایک مقصد کے لئے اور وہ مقصد ہے استحکام پاکستان تاکہ اس میں خدا کی حکومت قائم ہو سکے۔ بیس آدمی جمع ہو جاؤ اور اپنے میں سے ایک سرکردہ منتخب کر لو۔ یہ بیس اس سرکردہ کے پیچھے چلیں۔ اور پھر بیس سرکردہ جمع ہو کر اپنے میں سے ایک سرکردہ منتخب کر لیں اور اس طرح سے یہ سلسلۂ دراز ہمہ گیر ہوتا چلا جائے۔ تقوموا للہ مثنیٰ وفرادیٰ ثم تتفکروا (۳۴/۴۶) اللہ کے لئے ایک ایک دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ پھر سوچو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ بس یہ ہے حقیقی کامیابی کا راز!

اور اگر تم نے یہ نہ کیا تو پھر سارا پاکستان اسی طرح سے بت کدہ بن جائے گا جس طرح سومنات کی مسجد بت خانہ بنا دی گئی۔ ویالیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیا منسیا۔

---

(۲)

محترم چودھری خلیق الزمان صاحب نے جب مئی گذشتہ میں فرمایا تھا کہ ابھی وقت نہیں آیا کہ پاکستان میں شریعت کے تعزیری قوانین نافذ کئے جائیں، تو جون کی اشاعت میں، ہم اس کا طائرانہ سا جائزہ لیتے ہوئے

آگے بڑھ گئے تھے۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ چودھری صاحب کا ذاتی خیال نہیں، بلکہ مسلم لیگ شاید یہی مسلک اختیار کرنے والی ہے۔ ۱۷ جون کو کراچی میں ایک عوامی اجتماع کے موقعہ پر محترم عبدالحامد صاحب بدایونی نے چودھری صاحب سے دریافت کیا کہ مسلم لیگ نے حصول پاکستان سے پیشتر قوانین شریعت کے نفاذ کا جو وعدہ کیا تھا، وہ اسے اب پورا کیوں نہیں کر رہی۔ تو اس کے جواب میں چودھری صاحب نے فرمایا کہ

> مسلم لیگ نے باضابطہ (Formally) کوئی ایسا وعدہ نہیں کیا۔ اس کا نصب العین حصول پاکستان تھا۔ تاکہ مسلم اکثریت کے صوبے ہندوؤں کے تغلب سے آزاد ہو جائیں۔
>
> (ڈان ۱۸/۶)

یہ جواب جس قدر حسرت انگیز ہے اسی قدر افسوسناک بھی۔ کم از کم چودھری صاحب جیسے سنجیدہ کارکن سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی؟ اس میں شبہ نہیں کہ مسلم لیگ نے ایسا کوئی ریزولیوشن پاس نہیں کیا جس میں یہ صراحت موجود ہو کہ پاکستان کا آئین کونسا ہو گا لیکن دس سالہ تحریک پاکستان کے دوران میں لیگ کے ارباب حل وعقد اس باب میں جو کچھ فرماتے رہے ہیں اگر اسے اکٹھا کیا جائے تو ایک اچھا خاصا کتب خانہ بن جائے۔ اور تو اور خود لیگ کے صدر محترم، ملت کے قائد اعظم، مملکت پاکستان کے گورنر جنرل جناب جناح اس عنوان پر (حصول پاکستان سے پہلے اور اس کے بعد) جو کچھ فرما چکے ہیں وہ سب قوم کے خاطر میں متحضر ہے۔ ان سے نیچے اتریئے، تو لیگ کے سیکریٹری جنرل، حکومت پاکستان کے وزیر اعظم، جناب لیاقت علی خاں صاحب ابھی گزشتہ ایام جو کچھ اس باب میں بیان کر چکے ہیں وہ ابھی تک فضا کی پہنائیوں میں گونج رہا ہے۔ اگر تحقیق کی جائے تو شاید خود چودھری صاحب کی ایسی تقاریر بھی مل جائیں جن میں پاکستان کی غرض وغایت یہی بتائی گئی ہو۔ تو کیا یہ سب کچھ محض سیاسی ہتھکنڈہ ہی تھا؟ کیا چودھری صاحب نے یہ جواب دیتے وقت اتنا بھی سوچا ہے کہ انہوں نے اس سے ملت کی نگاہوں میں، اعیان وارکان لیگ کی رہی سہی وقعت بھی کھو دی ہے؟ اور ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اگر اس باب میں کسی نے ایک لفظ بھی نہ کہا ہوتا تو بھی اس مطالبہ کا وزن ایک پرکاہ کے برابر کم نہ ہوتا۔ اس لئے کہ اپنے آپ کو مسلمان کہلوانے والے کے نزدیک یہ مطالبہ ایمان کی حیثیت رکھتا ہے جس کے لئے نہ اسے کسی لیگ کے ریزولیوشن کی ضرورت ہے اور نہ کسی لیڈر کے بیان کی۔ مسلمان کے نزدیک آزادی سے مفہوم ہی یہ ہے کہ اسے قرآنی نظام حکومت قائم کرنے کی قدرت حاصل ہو۔ اگر یہ نہیں تو ہر آزادی جہنم میں جھونک دینے کے قابل ہے! مسلمان کے نزدیک تو یہ سوال ہی عبث ہے کہ اس کا آئین کونسا ہوگا۔ اس سوال کا جواب تو اس نے اسی دن دیدیا جب اقرار کر لیا کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے محترم قائد اعظم نے کیا خوب فرمایا تھا کہ تم پوچھتے ہو کہ مسلمانوں کا آئین کیا ہوگا؟ کیا جب مسلمان اپنے لئے آئین بنائیں گے تو وہ آئین شریعت کے سوا کوئی دوسرا بھی ہو سکتا ہے؟

اگر چودھری صاحب کو اس باب میں کچھ شبہ ہو کہ مسلمانوں کا مطالبہ کیا ہے اور انہوں نے لیگ کا ساتھ

> خود رسولِ خدا نے قوانینِ شریعت کا نفاذ اس وقت تک نہیں کیا جب تک آپ نے لوگوں کی اخلاقی سطح کو اتنا بلند نہیں کر لیا کہ وہ نظم و ضبط کی زندگی کے لئے تیار ہو جائیں۔

کیا اچھا ہوتا اگر محترم چودھری صاحب اپنے خیالات کی تائید میں منطقی دلائل تک ہی محدود رہتے اور اس قرآن کو اپنے نیزے پر نہ لٹکاتے۔"

چودھری صاحب کی مراد غالباً یہ ہے کہ حضورؐ نے اپنی مکی زندگی میں قوانین کو نافذ نہیں کیا۔ مدنی زندگی میں جاکر کیا۔ لیکن مکی زندگی میں مسلمانوں کو کوئی سیاسی حیثیت ہی حاصل نہ تھی۔ وہ زندگی اس قوتِ نافذہ کے حصول کے جد و جہد کی زندگی تھی جس کی بنا پر نظامِ شریعت کو ایک مؤثر حقیقت کی حیثیت سے قائم کرنا مقصود تھا۔ یہ قوت مدنی زندگی میں جاکر حاصل ہوئی۔ اس لئے یہ سمجھنا درست نہیں کہ مکی زندگی میں حضورؐ اس کا انتظار فرمارہے تھے کہ لوگوں کی اخلاقی سطح بلند ہو جائے تو پھر قوانینِ شریعت کا نفاذ کیا جائے۔ اسلام کا نظامِ شریعت تو ایک ایسی ہمہ گیر حیثیت رکھتا ہے کہ اس سے اخلاقی سطح بھی خود بخود بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کا قانون میکانکی طور پر عمل پیرا نہیں ہوتا بلکہ، چونکہ وہ خود فطرتِ انسانی کا ترجمان ہے اس لئے اس سے انسانی فطرت اپنے صحیح مقام کو حاصل کر لیتی ہے۔ یہ ایک لمبی بحث ہے کہ اسلامی نظام کس طرح ان کی ہیئتِ اجتماعیہ کے مسائل و معاملات کے حل کے ساتھ ساتھ نفوس و قلوب کی بھی اصلاح کرتا جاتا ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ ایسا ضابطۂ قوانین نہیں جس کا مقصد تعزیرات کی رو سے جرائم کا انسداد ہو بلکہ وہ ایک ایسا نظام ہے جو انسدادِ جرائم کے ساتھ ساتھ انسان میں ایسے نفسیاتی تغیرات پیدا کرتا جاتا ہے کہ اس سے اس کی فطرت، سزا کے خوف سے جرائم سے مجتنب نہیں رہتی بلکہ ان سے اس طرح ابا کرنے لگ جاتی ہے جس طرح ایک صاحب عقل و ہوش انسان سنکھیا سے ابا کرتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ اسلامی نظام اُس وقت نافذ ہو سکتا ہے جب پہلے معاشرہ کی اخلاقی سطح بلند کر لی جائے۔ اسلامی نظام کی فطرت و خاصیت سے ناواقفیت کی دلیل ہے (اس موضوع پر ہم ان شاء اللہ کسی دوسرے وقت تفصیل سے لکھیں گے)، اس وقت صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ یہ سمجھنا درست نہیں کہ مکی زندگی میں اس لئے قوانین کا نفاذ نہیں کیا گیا کہ لوگوں کی اخلاقی سطح ابھی بلند نہیں ہوئی تھی۔ چودھری صاحب محترم کو اس کا علم ہوگا کہ قریشِ مکہ آخر وقت تک حرکتِ اسلامی کے مخالف رہے اور اس مخالفت اور ضد میں ان کی اخلاقی سطح پہلے سے بھی زیادہ گرتی چلی گئی۔ جب حضورؐ نے مکہ فتح کیا ہے تو ان کی اخلاقی حالت اسی پست سطح پر تھی۔ لیکن فتح مکہ کے ساتھ ہی وہ لوگ اسلام لے آئے۔ اب چودھری صاحب کی دلیل کے مطابق، چاہیئے یہ تھا کہ پہلے ان کی اخلاقی سطح کو بلند کیا جاتا پھر قوانینِ شریعت کا نفاذ کیا جاتا۔ لیکن تاریخ اس پر شاہد ہے کہ ایسا نہیں کیا گیا بلکہ ان کے اسلام لانے کے ساتھ ہی ان پر تمام قوانینِ اسلامی نافذ کر دیئے گئے۔ اس لئے کہ اب اسلام کے ساتھ قوتِ نافذہ بھی موجود تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ قوانینِ شریعت کی تنفیذ کے لئے اخلاقی سطح کی بلندی کا انتظار نہیں کیا جاتا۔ قوتِ نافذہ کا انتظار کیا جاتا ہے۔ ہمیں ہندوستان میں قوتِ نافذہ حاصل نہ تھی اس لئے اسلام محض وعظ

ونصیحت کا نام تھا۔ اسی قوتِ نافذہ کے حصول کی جدوجہد کا نام تحریکِ پاکستان تھا۔ حصولِ پاکستان کے بعد یہ قوت حاصل ہوگئی۔ اس لئے اب نظامِ شریعت کے نفاذ میں مزید انتظار کی ضرورت نہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ بعض احکام کی تنفیذ تدریجی ہوتی ہے۔ لیکن جب تک ابتدا نہ ہوگی تدریج، کس طرح سے عمل میں آئے گی؟ اور یہاں یہ حالت ہے کہ ابھی تک مجلس دستور ساز نے (چودھری صاحب کے الفاظ میں، سرکاری طور پر Officially) اس کا بھی فیصلہ نہیں کیا کہ وہ کس قسم کا آئین بنانا چاہتی ہے۔ اگر اس کا... فیصلہ کر دیا جائے کہ وہ آئین نظامِ شریعت پر مبنی ہوگا تو پھر اس آئین کی ترتیب و تدوین کیلئے بھی وقت لیجئے اور حسبِ مصالح بعض احکام کی تنفیذ بھی تدریجاً کیجئے۔ ہم چودھری صاحب سے متفق ہیں کہ "ایک رات میں شریعت کے قوانین کا نفاذ ممکن نہیں" (جنگ مورخہ ۴۹/۶/۲۰) لیکن اس امر کا فیصلہ تو ایک رات میں ممکن ہے کہ حکومتِ پاکستان کا آئین کن بنیادوں پر استوار ہوگا! اس فیصلہ میں کونسا امر مانع ہے!

چودھری صاحب نے اس ضمن میں دو باتیں ایسی فرمائی ہیں، جن سے ہم متفق ہیں۔ آپ نے فرمایا ہے۔

جو لوگ پاکستان میں قانونِ شریعت کا مطالبہ کرتے ہیں انہیں چاہیئے کہ پہلے اپنے ذہن میں اس مطالبہ کی وضاحت کرلیں اور یہ بتائیں کہ بالآخر مسلم حکومت اور قانونِ شریعت سے ان کا مفہوم کیا ہے؟

طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت مئی ۱۹۴۹ء کے لمعات کو دیکھئے جن میں یہی بات ہم نے کہی ہے۔ اس مطالبہ کی وضاحت نہایت ضروری اور سب سے مقدم ہے۔ لیکن ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ جس طرح قوانینِ شریعت کا مطالبہ کرنے والے ذہنی الجھاؤ میں مبتلا ہیں اسی طرح خود چودھری صاحب بھی نظامِ شریعت کی اصل حقیقت سمجھنے میں پریشانیٔ فکر و نظر کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ چودھری صاحب کے ذہن میں بھی قانونِ شریعت، چور کے ہاتھ کاٹنے اور زانی کو سنگسار کرنے سے آگے کچھ نہیں اور اسی سے وہ زیادہ خائف معلوم ہو رہے ہیں۔ حالانکہ یہ نظام پوری زندگی کو ایک نئے قالب میں ڈھال دینے کا نام ہے۔ اور یہ نیا قالب وہ ہے جس میں انسانیت اپنے شرف و مجد کی انتہائی پختگی حاصل کرتی ہے۔ لہٰذا اس سے نہ مسلمانوں کو ڈرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی غیر مسلموں کو۔

دوسری بات چودھری صاحب نے یہ فرمائی ہے کہ۔

آج آپ کے کتنے فرقے ہیں۔ یہ تمام فرقے باہمی اختلافات رکھتے ہیں۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ ان اختلافات کو نظر انداز کر کے کسی ایک فرقہ کو اختیار دے دیا جائے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ہمیں ایک درمیانی راہ نکالنی ہے۔ ہم اس وقت کسی قسم کا اختلاف برداشت نہیں کر سکتے۔

(جنگ مورخہ ۴۹/۶/۲۰)

اصل مرض یہی ہے جس کی طرف ہم خود مئی کی اشاعت میں توجہ دلا چکے ہیں۔ لیکن اگر چودھری صاحب یہ خیال کرتے ہیں کہ "ابھی وقت نہیں۔" کچھ عرصہ کے بعد ان فرقوں کے اختلافات مٹ جائیں گے اور پھر ہم اس قابل

ہو جائیں گے کہ ایک ایسا ضابطہ قوانین شریعت مرتب کرلیں جو ان تمام فرقوں کے نزدیک قابلِ قبول ہو۔ تو یہ ان کی خوش فہمی ہے۔ یہ فرقے صدیوں سے چلے آرہے ہیں۔ اور جیسا کہ فرقہ وارانہ عصبیت کا قاعدہ ہے مرور زمانہ سے ان کی گرہیں اور سخت ہوتی جاتی ہیں۔ ان کی بنیاد شخصیت پرستی کی تقلید جامد پر ہے اور جمود میں لچک نہیں ہوا کرتی۔ اس لئے ان فرقوں میں "درمیانی راہ" اس طرح سے کبھی نہیں نکل سکے گی۔ ان میں درمیانی راہ وہی ہو گی جس کی طرف طلوع اسلام دعوت دیر رہا ہے۔ اور وہ دعوت یہ ہے کہ ان تمام فرقوں سے کہا جائے کہ تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم۔ آؤ۔ ہم سب اس ایک نقطہ پر جمع ہو جائیں جو ہم سب میں مشترک ہے۔ اور وہ نقطہ مشترکہ قرآن کے سوا اور کیا ہے؟ یہ کہنا غلط ہے کہ "قرآن کے باوجود" ان میں اختلافات موجود ہیں۔ یہ اختلافات، قرآن کے باوجود نہیں بلکہ قرآن کو الگ ہٹا کر، انسانوں کے خود ساختہ جزئیات کو دین بنا لینے کی وجہ سے ہیں۔ ان سے پوچھئے کہ ان کا قرآن پر ایمان ہے یا نہیں۔ اس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوگا۔ اور ضابطہ شریعت قرآن میں محفوظ ہے (تفصیل اس اجمال کی چند صفحات آگے "اسلامی نظام" کے مضمون میں ملے گی جس میں صاحب مضمون نے نہایت شرح و بسط سے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ ہمارا نظام شریعت کس طرح قرآنی خطوط پر متشکل ہو سکتا ہے) ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہماری مجلس آئین ساز پہلے دن ہی اس کا اعلان کر دیتی کہ پاکستان کا ضابطہ آئین، قرآن پر مشتمل ہوگا۔ تو اس سے نہ کسی کو مجالِ انکار ہوتی اور نہ گنجائش اختلاف۔ یہی وہ "درمیانی راہ" ہے جس میں ان تمام مشکلات کا حل ہے۔ جو اس باب میں ارباب فکر و نظر کے لئے وجہ سوہانِ روح ہو رہی ہیں۔ ہماری ہزار سالہ تاریخ میں یہ پہلا موقع آیا ہے کہ ہم قرآن کو از سرِ نو اپنے آئین کا محور بنا لیں لیکن اس کے لئے مومنانہ جسارت درکار ہے۔ اگر ہمارے اربابِ حل و عقد نے اس جسارت سے کام لیا تو یہ دیکھ لیں گے کہ مشکلات اور پریشانیوں کے وہ تمام بادل جو اس وقت افقِ اذہان پر بری طرح چھائے ہوئے ہیں کس طرح چھٹ جاتے ہیں اور کس طرح مسلمان ایک مرتبہ پھر وہی مسلمان بن جاتا ہے جسے اللہ نے اپنی آخری کتاب کی وراثت کے لئے منتخب کیا تھا

ہمیں خوشی ہوئی کہ محترم چودھری صاحب نے بالآخر اس کا اعتراف فرمایا کہ:-

"شریعت اسلامی ہماری منزل مقصود ہے اور پاکستان کا قیام اسی لئے عمل میں آیا ہے"

(جنگ

اور ہم ان سے اس باب میں بھی ہم نوا ہیں کہ۔

یہ نعرہ بے سمجھے اور بے عمل لگانا ملت کے ساتھ سب سے بڑی دشمنی ہے (ایضاً)

لیکن ہم اس پر اس قدر اضافہ اور کرنا چاہتے ہیں کہ موجودہ اختلافات سے ڈر کر خود قیام نظام اسلامی سے ہی اغماض برت لینا یا اسے غیر متعین طور پر التوا میں ڈالتے چلے جانا بھی ملت کے ساتھ دوستی نہیں ہے۔ مومن کا شعار لا یخافون لومۃ لائم ہے۔ اس کا قلب اللہ کے سوا کسی کے ڈر کا کاشانہ نہیں بنتا۔ جب انفرادی طور پر مومن کی یہ شان ہے تو ان کی حکومت کو تو اس باب میں اور بھی لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون کا

مظہر ہونا چاہیئے لہٰذا اس میں ڈرنے اور جھجکنے کی کوئی بات نہیں۔ اگر اس جھجک میں پاکستان کے آئین نو کی خشت اول غلط رکھی گئی تو یہ دیوار بھی اسی طرح ثریا تک ٹیڑھی اٹھتی جائے گی جس طرح مسلمانوں کی اور سلطنتوں میں اس قسم کی کج بنیاد دیواریں اٹھی ہوئی ہیں اور جنہوں نے آج ایسے مستحکم قلعوں کی صورت اختیار کر رکھی ہے جن کی حفاظت استبداد و ملوکیت کی آہنی سنگینیں کر رہی ہیں۔

خدا نہ کرے کہ پاکستان کی یہ جنت جو مبدا رفیض کی کرم گستری سے ہمیں یوں ہی مزد مساعی حاصل ہو گئی ہے انسانی قوانین کی لعنت سے جہنم بن جائے۔

اسی قسم کی آواز ایک اور گوشے سے بھی اٹھی ہے اور وہ گوشہ ہے قادیانی نبوت کا۔ چنانچہ مرزا بشیر الدین صاحب محمود نے کوئٹہ میں ایک تقریر کے دوران میں فرمایا کہ

> پاکستان کے مسلمانوں کو قوانین شریعت کے فوری نفاذ کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر وہ اس کی بجائے اچھے مسلمان بننے کی کوشش شروع کریں تو یہ زیادہ اچھا ہو اور اس سے ہمارے مذہب کا مقصد بہتر طور پر پورا ہو۔ (ڈان ۱۶ [illegible])

مرزا صاحب کے اس اضطراب کی علت بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ قوانین شریعت کے نفاذ میں یہ سوال بھی تو سامنے آئے گا کہ اس کی رو سے مرزائی حضرات کی حیثیت کیا ہے۔ جو نبی اکرمؐ کے بعد ایک جدید نبوت کے قائل ہیں اور اس نبوت پر ایمان نہ لانے والوں کو مسلمان نہیں سمجھتے۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب مرزائی حضرات کے لئے کچھ خوش آیند نہیں ہوگا۔ اس لئے ان کے حق میں یہی بہتر ہے کہ

ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں

اسی لئے یہ حضرات تحریک پاکستان کے بھی مخالف تھے۔ اس وقت ان ہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ تفصیل پھر کبھی۔

لیکن ضمنی طور پر ہم جناب مرزا صاحب سے اتنا دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے جو فرمایا ہے کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ اچھے مسلمان بنیں۔ تو اس سے ان کا مفہوم کیا ہے؟ ان کا تو یہ عقیدہ ہے کہ مسلمان مسلمان ہی نہیں ہو سکتا جب تک وہ مرزا صاحب کی نبوت پر ایمان نہ لائے۔ تو اس صورت میں ایک مسلمان مرزا صاحب کی نبوت پر ایمان لائے بغیر اچھا مسلمان کس طرح بن سکتا ہے

---

(۳)

دورِ حاضرہ کی مسلّمہ صداقتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ اس صداقت کے مظاہرے جس طرح گذشتہ جنگ کے زمانہ میں نگاہوں کے سامنے آتے رہے اس پر چہرۂ دیدۂ عبرت شاہد ہے شرافت انسانی کی کونسی شق تھی جس کی دھجیاں بے محابا نہیں بکھیری گئیں۔ اور آئین و قانون کا کونسا گوشہ تھا جس کی مٹی بے دریغ پلید نہیں کی گئی۔ رحم و کرم تو کجا، عدل و انصاف تک کو کسی نے پاس نہیں پھٹکنے دیا۔ اور اس کے باوجود یہ اکابرین اقوام عالم، معتبر کے معتبر بنے رہے۔ اس لئے کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ روا ہے۔

اسلام نے بھی بعض ناگزیر حالات میں جنگ کی اجازت دی ہے لیکن ان شرائط و قیود کے ساتھ کہ حفظ آئین و احترام حقوق انسانیت کی ایسی مثال دورِ حاضرہ کی عدالتوں میں بھی نہ مل سکے۔ لیکن آج اگر اس قصہ کو کسی کے سامنے دہرایا جائے تو وہ یہ کہکر منہ پھیر لے گا کہ

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

یہ درست ہے کہ وہ قدح بھی ٹوٹ گیا اور وہ ساقی بھی نہ رہا۔ لیکن اس کے باوجود اس خمخانۂ ازلی کے ٹوٹے ہوئے پیالوں سے بھی بعض اوقات ایسی کیف بار و نشاط آور بوئے جاں نواز اٹھتی ہے جو اس آتش رفتہ کے لئے سراغ کا کام دیتی ہے جس نے خون رگ کائنات میں ایک نیا تموج پیدا کر دیا تھا۔ فلسطین میں یہودی جو کچھ عربوں کے ساتھ کر رہے ہیں اس کے تصور سے انسانیت سرنگوں و شرمسار ہے۔ ان بدبخت سیاہ کاروں کے ہاتھ سے عربوں کی کوئی قابل احترام متاع محفوظ نہیں۔ اب ان میں کھلے بندوں جنگ ہو رہی ہے جس میں یہودیوں کے بوڑھے۔ بچے۔ عورت۔ مرد سب شریک ہیں۔ اور عربوں کی تخریب میں ہمہ تن مصروف۔ نوجوان یہودی لڑکیاں میدان جنگ میں لڑتی ہوئی گرفتار ہو جاتی ہیں۔ یہ وہی جنگ ہے جس میں یورپ کی مسلمہ صداقت کے مطابق، دشمن کے خلاف سب کچھ روا ہے۔ وہ لڑکیاں خود اقرار کرتی ہیں کہ وہ محارب ہیں۔ اس نئے آئین جنگ کی رو سے وہ قیدی ہیں لیکن معلوم ہے کہ یہ عرب ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؛ وہ انہیں بحفاظت یہودیوں کے یہاں پہنچا دیتے ہیں۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ یہ تو جنگی قیدی ہیں انہیں ایسے کیوں چھوڑ رہے ہو تو ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے جواب دیتے ہیں کہ یہ "یونہی بچیاں ہیں" (ڈان ۹ ۴۸/۶)۔ یہ ہے ان "وحشی مسلمانوں" کی یادگار جن کے متعلق یورپ کے مورخوں نے ایسے ایسے نقشے دنیا کے سامنے پیش کئے ہیں جنہیں دیکھ کر۔ جناب پرویز کے الفاظ میں "قتل و غارت گری، بربادی و تباہی، ہلاکت و خوں ریزی، جور و تظلم، ستم و استبداد کے خونی مناظر ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ جن میں نظر آتا ہے کہ وحشی اور خونخوار جنگلی انسانوں کے غول کے غول۔ نیزوں اور تلواروں کی جھنکار میں سیل حوادث کی طرح کف بر دہاں بڑھتے چلے آرہے ہیں، جن کے جلو میں سبعیت اور بربریت کے مجسمے، ہولناک آہن پوش جنات کی شکل میں آگ اور خون کی ہولی کھیلتے، اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں میں امنڈتے چلے آتے ہیں۔ اور اس قہر خداوندی، اس سیلاب بلا، اس طوفان بلاخیز کے سامنے، تہذیب و تمدن۔ علم و عمرانیت۔ عدل و انصاف۔ عفت و عصمت۔ مذہب و مسلک ایک ایک کر کے جڑ سے اکھڑتے چلے جاتے ہیں۔ مظلوموں کی فریاد۔ یتیموں کی آہ و بکا۔ بیواؤں کا نالہ و فغاں۔ آسمان تک جاتا ہے اور ٹکرا کر واپس آجاتا ہے کہ گویا۔ (نعوذ باللہ) اس خوں خوار قوم کے خدا کا دروازہ بھی ان سب کے لئے بند ہے۔ جہاں جہاں سے یہ قیامت صغریٰ گزرتی ہے، آبادیاں ویرانہ بن جاتی ہیں۔ بستیاں اجڑ جاتی ہیں کتب خانے جل کر راکھ کا ڈھیر رہ جاتے ہیں۔ تہذیب و تمدن کے آئینہ دار قصر شاہی کھنڈرات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ کہیں ٹوٹی ہوئی صلیبوں کے انبار نظر آتے ہیں۔ کسی جگہ زنار کا ڈھیر دکھائی دیتا ہے۔ مندر ویران ہیں۔ گرجے مسمار ہیں۔ نہ برہمن کو کہیں امن ہے نہ کلیسا کے راہب کے لئے امن، نہ عورتیں محفوظ ہیں نہ بچے معصوم، کچھ قتل

گردیئے گئے جو باقی بچ گئے وہ ناک میں نکیل ڈلوائے حبشی سرداروں کے کوڑے کھاتے، نخاس کی طرف گھسٹتے چلے جارہے ہیں کہ وہاں انسانیت عظمیٰ دو دو ٹکوں میں فروخت کی جائے۔"

(اسلام اور مذہبی رواداری۔ مطبوعہ طلوع اسلام بابت جون ۱۹۳۹ء)

یہ ہے مغربی مصنفین کے قلم سے کھینچی ہوئی تصویر ان مسلمانوں کی جن کے ہاں آج بھی میدان کارزار میں حسن سلوک اور احترام نسائیت کی ایسی مثال مل رہی ہے جس کی نظیر پیش کرنے سے یورپ کی ساری تاریخ قاصر ہے۔ یہ ہے اس اسلامی تعلیم کے مٹے ہوئے نقوش کا اثر جو آج بھی جب کبھی مسلمان کے تحت الشعور میں کروٹ لیتی ہے تو دنیا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں کہ یہ نورانی کرن کس چشمۂ آفتاب سے پھوٹی ہے! اے کاش۔ اس آفتاب جہاں تاب سے انسانی تخیلات کے بادل کہیں چھٹ کر الگ ہو جائیں تو عصر حاضر کا راہ گم کردہ انسان بھی اپنی منزل تک پہنچ جائے۔

۴

اشاعت رواں میں، "اسلامی نظام" کے عنوان سے جناب پرویز کا ایک مبسوط مقالہ زینت دہ اوراق طلوع اسلام ہو رہا ہے۔ اس مقالہ میں جناب پرویز نے ایک ایسی بنیادی حقیقت کو اجاگر کیا ہے جس کی روشنی میں پاکستان میں اسلامی نظام کی ترتیب و تدوین کا مسئلہ ایسا ہی سہل اور عین مطابق فطرت بن جاتا ہے جیسے قرآن کی ہر دوسری تعلیم۔ یہ مقالہ نہایت غور و فکر سے پڑھے جانے کے قابل ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر ہم نے اسے پمفلٹ کی صورت میں بھی چھپوا لیا ہے تاکہ اس کی اشاعت عام ہو سکے۔

طلوع اسلام کے دور اول میں جہاں اور ماندات سے اس کی دعوت کی مخالفت ہوئی (کہ حق ہمیشہ تلخ ہوا کرتا ہے) ایک طریق مخالفت یہ بھی اختیار کیا گیا کہ اس پر "منکر حدیث اور اہل قرآن" کا لیبل لگا دیا گیا۔ ہم اس باب میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ طلوع اسلام کا لیبل صرف ایک ہی ہے اور وہ وہی ہے جو خدائے حی و قیوم کے "پیٹنٹ آفس" سے ھو سمّٰکم المسلمین کی مہر سے لگایا جاتا ہے اور اس لیبل کا رنگ وہی جو صبغۃ اللہ کے خم کدہ سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کے سوا نہ اس کا کوئی لیبل ہے اور نہ اس لیبل کا کوئی اور رنگ۔ اگر یہ "کفر" ہے

اور مسلمانی" اس کے علاوہ کچھ اور، تو طلوع اسلام کو اعتراف ہے کہ ع کافر عشقم مسلمانی مرا در کار نیست

طلوع اسلام کا دعویٰ ہے اور علیٰ وجہ البصیرت دعویٰ، کہ مسلمان کی تمام مشکلات کا حل قرآن میں ہے۔ جب تک یہ قرآن سے دور ہے، سعادت دارین سے دور ہے۔ جس دن اس نے قرآن کو اپنا لیا، اس کی دنیا بدل جائے گی کہ قرآن میں یہ قاعدہ ہے کہ

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود	جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

آپ اس مقالہ کو ٹھنڈے دل سے پڑھئے۔ اس کے بعد اگر آپ کے دل میں کوئی شکوک باقی رہ جائیں تو طلوع اسلام کے صفحات نہایت خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کریں گے۔

نصرٌ من اللہ

(جناب اسد ملتانی)

جو خدا کا بندہ بھٹک گیا ہے خدا کے دیں کی حدود سے
کبھی دب رہا ہے ہنود سے کبھی ڈر رہا ہے یہود سے

نہ نظر خدائے ودود پر، نہ امید اپنے وجود سے
ہیں توقعات کوئی اگر تو فرنگیوں کے وفود سے

کوئی کام قوم کا ہو سکے کسی وقت فرصت اگر ملے
اسے شغل نالہ و آہ سے، اسے بزم رقص سرود سے

بزباں درود و ثنائے رب، بعمل حمایتِ بولہب
یہ ثنا و حمد تو ہے عجب یہ تو دل لگی ہے درود سے

ہو تڑپ جہاد کی راہ کی ہو طلب رضائے الٰہ کی
نہ ہوس ہو منصب و جاہ کی نہ غرض ہو نام و نمود سے

یہ تمام جہد بہ شد و مد جو خدا کی راہ میں ہو اسدؔ
تو مجاہدین کی پھر مدد ہو ملائکہ کے جنود سے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی نظام

پرویز

غالباً سنہ ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے کہ "شخصیت پرستی" کے عنوان سے میرا ایک مبسوط مضمون شائع ہوا۔ اس میں میں نے بتایا تھا کہ اسلامی نظام زندگی میں قرآن، احادیث اور فقہ کی صحیح حیثیت کیا ہے اور انہیں کس مقام پر رکھنا چاہیئے۔ چونکہ مسلمانوں میں ایسے فرقے موجود ہیں جن کا مسلک رواۃ پرستی اور ائمہ پرستی ہے اور میرے مضمون میں خالص "خدا پرستی" کی طرف دعوت دی گئی تھی اس لئے ان کی طرف سے اس دعوت کی مخالفت لازمی تھی۔ اس لئے بھی کہ عجمی تصورات جو اس شخصیت پرستی کے موجب ہیں، مسلمانوں کے دل و دماغ پر صدیوں سے مسلط ہو رہے ہیں اور ان کے اثرات ان کے خون کے ذرات تک میں سرایت کر چکے ہیں ان کا ازالہ ایک دن میں نہیں ہو سکتا۔ معتقدات، خواہ کتنے ہی غلط کیوں نہ ہوں، انسان کی عزیز ترین متاع ہوتے ہیں اور وہ اس متاع گراں قدر کے چھننے میں سخت صدمہ محسوس کرتا ہے۔ بنابریں اس، دعوت کی مخالفت اور بھی شدید ہوئی۔ حتیٰ کہ میرے بعض قریبی دوستوں تک نے اس سے متاثر ہو کر مجھ سے کہا کہ تم نے اس نظری بحث کو کیوں چھیڑ دیا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ یہ بحث نظری نہیں ہے۔ نظری بحثوں میں الجھنے کے لئے میرے پاس وقت کہاں ہے۔

بقول لسان العصر مرحوم ؎

فلسفی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں کمی ہی نہیں

یہ وہ زمانہ تھا جب حصول پاکستان کی تحریک جاری تھی۔ اس تحریک سے میری اور دیگر ہمنوا حضرات کی وابستگی اس بناء پر تھی کہ ہمارے نزدیک اس خطۂ ارض میں اسلامی نظام زندگی کی از سرِ نو ترویج کے امکانات تھے۔ ہر چند اس وقت یہ توقع تو کسی کو بھی نہ تھی کہ پاکستان اتنی جلدی مل جائے گا۔ لیکن یہ امید تو تھی کہ کسی نہ کسی دن یہ نشید کامرانی ہمارے لئے فردوس گوش ضرور بنے گی۔ میرے سامنے سوال یہ تھا کہ تشکیل پاکستان کے بعد، سب سے پہلا اقدام اسلامی نظام حکومت کی ترتیب و تدوین کا ہوگا۔ ضروری تھا کہ اس کے لئے ذہنوں کو ہموار کیا جائے اور اس کے راستے میں جو الجھاؤ اور پیچیدگیاں حائل ہونے والی ہیں انہیں رفتہ رفتہ صاف کر دیا جائے تاکہ جب اس نظام کی عملی تشکیل کا وقت آئے تو اس کی ترتیب میں وقت پیش نہ آئے۔ میں ڈرتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس وقت کثرتِ تعبیر سے یہ خواب پریشاں سے پریشاں تر ہو جائے اور جس طرح ترکوں نے اپنی دشواریوں سے تنگ آکر، نظام شریعت کو ناممکن العمل سمجھ لیا اور اپنے آئین و دساتیر کے نقشے معماران مغرب سے مستعار لے لئے۔ یہاں بھی ایسا ہی نہ ہو جائے اور پاکستان سے جس قدر امیدیں ہم نے باندھ رکھی ہیں، وہ موہوم خواب اور نگاہ فریب سراب سے زیادہ ثابت نہ ہوں۔ لہٰذا میں نے جو بحث چھیڑی تھی وہ نظری بحث نہ تھی بلکہ یکسر عملی نتیجہ کی طرف لیجانے والے مذاکرات تھے۔ چنانچہ آج اسلامی نظام کی تشکیل و ترویج کے متعلق جو آوازیں چاروں طرف سے اٹھ رہی ہیں وہ اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ یہ بحث یکسر عملی حیثیت لئے ہوئے تھی۔

اسلامی نظام، نہایت سیدھے سادے اصولوں پر قائم اور آئینۂ فطرت کی طرح صاف اور شفاف ہے۔ اس میں کہیں کثافت نہیں۔ ٹیڑھ نہیں، سلوٹ نہیں۔ جھول نہیں۔ ماتریٰ فی خلق الرحمٰن من تفوت خدا کی پیدا کردہ چیزوں میں کہیں نقص و تفاوت نہیں ہوا کرتا۔ فارجع البصر ھل تریٰ من فطور جدھر جی چاہے نگاہ اٹھا کر دیکھ لیجئے کہیں کسی گوشے اور کسی کونے میں بھی، فطور نظر نہیں آئے گا۔ ایک بار نہیں۔ بار بار نگاہ اٹھا کر

دیکھو ینقلب الیك البصر خاسئا وھو حسیر ہر بار نگاہ ناکام و نامراد کاشانہ چشم میں لوٹ آئے گی اور کہیں کوئی الجھاؤ نہ پائے گی۔ جس قدر الجھاؤ اور پیچیدگیاں۔ جتنی دشواریاں اور پریشانیاں، جس قدر اختلافات و نزاعات جتنی فرقہ بندیاں اور گروہ سازیاں ہیں سب ہماری پیدا کردہ ہیں۔

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے دُرد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو، میرے پیمانے میں ہے

اسلامی نظام کی بنیاد اس حقیقت کبریٰ پر ہے کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ اس اصل الاصول میں احترام آدمیت اور حقیقی مساوات کا راز پوشیدہ ہے۔ اطاعت صرف خدا کی جائز ہے اور کسی کی نہیں۔ حکومت کا حق صرف اس احکم الحاکمین کو ہے اس میں کوئی شریک وسہیم نہیں۔ ولا یشرك فی حکمہ احدا (کہف)

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری

قرآن کریم کی تعلیم اس باب میں ایسی صاف اور واضح ہے کہ اس کے متعلق کسی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت نہیں۔ چونکہ میرا خطاب اس وقت مسلمانوں سے ہے جن کا اس پر ایمان ہے، اس لئے مجھے اس کے متعلق بھی سردست کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ حکومت کا یہی اصول کس طرح فطرت انسانی کے مطابق ہے اور کس طرح خدا کی اطاعت، خود انسانی فطرت اعلیٰ و صحیح کے تقاضوں کی تسکین کا نام ہے۔ اس وقت مجھے صرف اتنا بتانا ہے کہ اسلام میں حکومت اور اطاعت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے اور کسی کو نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی اطاعت کس طرح کی جائے۔ وہ براہ راست تو کوئی حکم دیتا نہیں نہ ہی ہم سے ہم کلام ہوتا ہے۔ تو پھر اس کی اطاعت کا ذریعہ کیا ہے؟ اس کا جواب بھی صاف اور واضح ہے۔ یعنی اللہ تعالےٰ جن احکام کی اطاعت چاہتا ہے وہ اس نے بوساطت

جناب نبی اکرمؐ انسانوں تک پہنچا دیئے۔ ان ہی قوانین و ضوابط کے مجموعہ کا نام قرآن ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی بار بار صراحت کر دی ہے کہ اس کی اطاعت، قرآنی احکام کی اطاعت سے ہوگی لہٰذا، اسلامی نظام حکومت کی اساس قرآن کی اطاعت ہے۔ حکومت اسی کے مطابق قائم کی جائے گی۔ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸) "ان میں قرآن کے مطابق (جو اللہ نے نازل کیا ہے) حکومت قائم کرو" جو ایسا نہ کرے اسے اسلام سے کچھ واسطہ نہیں وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ (۵/۴۴) "جو قرآن کے مطابق (جو اللہ نے نازل کیا ہے) حکومت قائم نہ کرے (فیصلے نہ دے) تو وہ کافر ہے۔"

قرآن۔ خدا کی طرف سے آخری کتاب ہے جو انسانوں کو دی گئی ہے۔ اب غور کیجئے کہ چھٹی صدی عیسوی سے لیکر (کہ جب قرآن نازل ہوا) قیامت تک کس قدر مختلف زمانے آئیں گے اور ان زمانوں میں کس قدر مختلف طبقات کے لوگ ہوں گے۔ قرآن، تمام نوع انسانی کے لئے، تمام زمانوں کے لئے، خدائی حکومت کا جامع ضابطۂ قوانین ہے۔ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مختلف زمانوں میں انسانوں کی تمدنی زندگی (Social Life) کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ ہر زمانہ میں انسانوں کے طریق بود و ماند اور اسلوب معاش و معاشرت بدلتے رہتے ہیں۔ آج وسائل آمد و رفت کی وسعتوں سے ساری دنیا کی طنابیں کھنچ گئی ہیں جس سے انسانوں کے بین الاقوامی روابط و معاملات اس نہج و انداز کے ہوگئے ہیں کہ ہزار سال قبل اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ آج دنیا کی کوئی قوم خود مکتفی (Self Sufficient) اور دوسروں سے مستغنی (Independent) نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ عصر حاضر کے تمدنی تقاضے ازمنہ سابقہ کے تقاضوں سے مختلف ہوں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کی فطرت کے بنیادی تقاضے ایسے ہیں جو ماحول سے متاثر نہیں ہوتے۔ لہٰذا ان میں ہر دور زمانہ سے تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ مثلاً انسان کی طبیعی زندگی کو لیجئے۔ جس طرح چھٹی صدی عیسوی کے زمانہ کے انسان کی پیاس پانی سے بجھتی تھی۔ اسی طرح آج کے انسان کی پیاس کی تسکین بھی

پائی ہی سے ہوتی ہے۔ یا جہانِ ذوق و نظر (Appreciative world) میں جس طرح نزھت و لطافت ہزار سال پہلے کے انسان کے لئے وجہ شادابی قلب و نگاہ تھی اسی طرح آج کے انسان کے لئے باعث شگفتگی دیدہ و دل ہے۔ اسی اصول کے تابع، جس طرح صداقت و شرافت، ہزار سال پہلے کے انسان کے لئے باعث فخر و مباہات تھی اسی طرح آج کے انسان کے لئے بھی وجہ تکریم و تفضیل ہے۔ ان چیزوں پر زمانہ کی تبدیلی کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ

(۱) فطرتِ انسانی کے بنیادی تقاضے ایسے ہیں جو ماحول سے متاثر نہیں ہوتے اور مرورِ وقت سے ان میں تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں پڑتی۔

(۲) اور اس کی معاشرتی اور تمدنی زندگی کے ایسے تقاضے بھی ہیں جو زمانہ کی ضروریات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔

لہٰذا جس ضابطۂ قوانین و ضوابط کو تمام انسانوں کے لئے اور تمام زمانوں کے لئے۔ نظامِ زندگی بنا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ فطرتِ انسانی کے ان ہر دو تقاضوں کی تسکین کا سامان اپنے اندر رکھے۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو وہ کسی خاص وقت کے لئے نظامِ زندگی بن سکے گا۔ قرآن، دینِ فطرت (دین کے معنی ہیں قانونِ حیات) اس لئے ہے کہ اس میں فطرتِ انسانی کے ان بنیادی اصولوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یعنی اس میں

(۱) بعض اصول ایسے ہیں جن کی جزئیات بھی متعین کر دی گئی ہیں۔ یہ وہ احکام ہیں جن پر مرورِ زمانہ کا کچھ اثر نہیں ہوگا اور وہ ہمیشہ کے لئے ناقابلِ تغیر و تبدل ہوں گے ایسے احکام بہت تھوڑے ہیں۔ انگلیوں پر گن لینے کے لائق

(۲) باقی اصول ایسے ہیں جن کی صرف حدود متعین کر دی گئی ہیں۔ جزئیات متعین نہیں کیں ان کی جزئیات، ہر زمانہ کے انسان، اپنی اپنی ضروریات کے مطابق خود متعین کریں گے۔ دیکھنا صرف یہ ہوگا کہ یہ جزئیات، ان حدود سے متصادم

مثلاً قرآن میں، زانی، سارق، ڈاکو، باغی کی سزا متعین ہے۔ وضو کی تفصیل موجود ہے۔ جب کوئی انسان بلا وصیت مر جائے یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہ ہو، تو تقسیم ترکہ کے تمام حصے مقرر ہیں۔ وقس علی ہذا۔ ظاہر ہے کہ ان جزئیات کی تعیین سے منشاء خداوندی یہی ہے کہ ان میں تغیر و تبدل نہیں ہوگا۔ اس کے دوسری طرف، مثلاً نظام اقتصادیات میں قرآن نے ایک اصول بیان فرمایا ہے کہ روپیہ کی گردش اس طرح ہونی چاہیئے کہ وہ محض اوپر کے طبقہ میں ہی نہ پھرتا رہے۔ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ (۵۹) یہ ایک محکم اصول ہے جو بطور اصول قیامت تک کے لئے کارفرما رہ سکتا ہے لیکن وہ جزئی قواعد جن سے یہ مقصد حاصل ہو مختلف زمانوں میں بدلتے رہیں گے اس لئے قرآن نے ان کی تفاصیل و جزئیات سے بحث نہیں کی۔ یا مثلاً محاصل حکومت (Govt. Revenues) کے سلسلہ میں اس نے زکوٰۃ ٹیکس کا ذکر بار بار کیا ہے۔ لیکن سارے قرآن میں دیکھ جائیے کہیں بھی اس کی شرح (Rate) مقرر نہیں کی گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ شرح، مختلف زمانوں میں، حکومت کی ضروریات کے مطابق بدلتی رہیگی کبھی شاید ایسا وقت بھی آجائے کہ حکومت کو کسی ٹیکس کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اور کبھی ایسی اجتماعی اور ہنگامی ضروریات لاحق ہو جائیں کہ افراد کے لابدی اخراجات کے بعد جو کچھ باقی بچے، سب کچھ حکومت کو لے لینا پڑے (قل العفو کے یہی معنے ہیں) زکوٰۃ کی شرح کو بلا تعین چھوڑ دینے سے بصراحت ظاہر ہے کہ منشاء خداوندی یہی ہے کہ اس کی شرح، حکومت اسلامی اپنی ضروریات کے مطابق خود متعین کرے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر اس اصول کی طرح، اس کی شرح بھی ناقابل تغیر ہوتی تو قرآن نے جہاں تیس چالیس مرتبہ زکوٰۃ ادا کرنے کی تاکید کی ہے۔ ایک آیت میں اس کی شرح کا تعین بھی کر دیا جاتا۔ اللہ کے لئے یہ کونسی مشکل بات تھی۔

لہذا یہ ظاہر ہے کہ جن اصولوں کی جزئیات، قرآن نے متعین نہیں کیں، اس سے منشاء ایزدی یہی ہے کہ ان کی جزئیات، مختلف زمانوں کے تقاضوں کے مطابق ادلتی بدلتی رہینگی اس لئے اپنے اپنے زمانہ کی اسلامی حکومت ان کی تفاصیل خود طے کرلیگی۔ ان جزئیات کا نام

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۔ (ہم نے قرآن نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں) باقی رہیں وہ جزئیات جو شق ۱۲ کے مطابق حضورؐ نے متعین فرمائی تھیں، چونکہ وہ ابدی طور پر غیر تبدیل رہنے کے لئے متعین نہیں کی گئی تھیں۔ اس لئے حضورؐ نے نہ ان جزئی احکامات کو کہیں قلمبند کرایا۔ نہ انہیں کسی کو حفظ یاد کرایا۔ نہ ان کا کوئی مجموعہ امت کو دیا۔ اور چونکہ صحابہ کبارؓ اس حقیقت کبریٰ سے واقف تھے اس لئے نہ انہوں نے اس کا مطالبہ کیا اور نہ ہی کسی ایسے مجموعہ کو مدون کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ کتب تاریخ و آثار اس پر شاہد ہیں کہ نبی اکرمؐ نے قرآن کے سوا، امت کو اور کچھ نہیں دیا۔ اور مذکورہ صدر تصریحات کی روشنی میں اس کی لم بھی صاف طور پر سمجھ میں آجاتی ہے کہ

(۱) جن اصولوں کی جزئیات کو ابدی طور پر ناقابل تغیر و تبدل رکھنا منشائے خداوندی نہ تھا۔

(۲) اُن جزئیات کو ابدی طور پر غیر متبدل رکھنا منشائے نبی اکرمؐ کس طرح ہو سکتا تھا۔

اور جب یہ چیز نہ منشائے خداوندی تھی اور (لہذا) نہ منشائے رسول اللہ۔ تو حضورؐ ان جزئیات کو، قرآن کی طرح محفوظ کر کے، امت کو کیوں دیتے۔ رسول اللہ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ حضورؐ کے جانشین ہوئے (خلیفہ کے معنی جانشین ہیں) اب قرآنی اصول حکومت کے مطابق، حضرت صدیق اکبرؓ کے فیصلوں کی اطاعت "خدا اور رسولؐ" کی اطاعت کے مرادف ہو گئی۔ چونکہ آپ کے اور رسول اللہؐ کے زمانہ میں بُعد نہیں تھا، اور دونوں کے تمدنی مقتضیات ایک ہی تھے اس لئے عام طور پر نبی اکرمؐ کی متعین فرمودہ جزئیات میں تبدیلیوں کی ضرورت لاحق نہیں ہوئی۔ لیکن بایں ہمہ، جن معاملات میں کسی تبدیلی کی ضرورت لاحق ہوئی ان میں تبدیلی بھی کی گئی اور جو نئے امور دفعتاً سامنے آئے ان میں نئے فیصلے بھی دیئے گئے۔ کتب روایات و آثار میں ایسی مثالیں موجود ہیں جن میں خلفائے راشدینؓ نے نبی اکرمؐ کے فیصلوں سے مختلف فیصلے صادر فرمائے۔ امور حکومت میں سب سے اہم معاملہ خلیفہ کا انتخاب تھا۔ حضورؐ نے نہ کسی کو منتخب کیا تھا نہ نامزد۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کو نامزد فرمایا۔ اور حضرت عمرؓ نے انتخاب کو چھ حضرات میں محدود کر دیا۔ یہ فیصلے

ظاہر ہے کہ رسول اللہ کے فیصلہ سے مختلف تھے۔ یا مثلاً حضرت عثمانؓ نے جمعہ کی نماز میں دوسری اذان کا اضافہ کیا۔ شراب خوری کی سزا کا تعین نہ قرآن میں ہے نہ حضورؐ کے زمانہ میں اس کی تعین ہوئی تھی حضرت عمرؓ نے صحابہ کے مشورہ سے متعین کیا۔ حضرت عمرؓ کے متعلق کتب آثار میں ہے کہ آپ نے جب یہ فیصلہ کیا کہ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دیدیں تو وہ طلاق بائنہ مان لی جائے گی۔ تو آپ کو معلوم تھا کہ رسول اللہ ایسی طلاق کو بائن قرار نہیں دیتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے اسے نافذ قرار دیا اور فرمایا کہ لوگوں نے جو روش اختیار کر رکھی ہے اس کے پیش نظر اب یہی حکم مناسب ہے۔ چنانچہ یہ حکم نافذ العمل ہوا۔ اور شریعت کا حکم قرار پاگیا۔ یعنی رسول اللہ کے زمانہ میں ایک حکم، حکم شریعت تھا اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں، اس کے برعکس دوسرا حکم، حکم شریعت قرار پاگیا اور اب اسی حکم کی اطاعت، اطاعت "خدا اور رسول" مانی گئی۔ چنانچہ اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے امام ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ

> عہد عمرؓ کی سیاست کا تقاضا یہی تھا کہ یک وقت دی ہوئی تین طلاقوں کو بائنہ مان کر فیصلہ کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ فیصلہ کر کے آپ نے تحلیل کا دروازہ بند کر دیا تاکہ لوگ حلالہ سے باز رہیں۔

اسی طرح حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب سلطنت میں وسعت ہوئی تو اس کے ساتھ ساتھ تمدنی عمرانیات میں بھی وسعت ہو گئی اور ایسے ایسے امور اجتماعیہ سامنے آئے جو نبی اکرمؐ کے عہد مبارک میں پیش نہ آئے تھے چنانچہ ان معاملات و قضایا کے متعلق نئے نئے احکام وضع کرنے پڑے۔ مثلاً

لہ مجھے اس وقت حضرت عمرؓ کے اس اجتہادی فیصلہ پر بحث مقصود نہیں۔ اس وقت تو صرف اتنا بتانا ہے کہ ہوا خلفائے راشدینؓ اس حقیقت سے آشنا اور اس پر عمل پیرا بھی تھے کہ نبی اکرمؐ کی متعین فرمودہ جزئیات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے یعنی وہ جزئیات ابدی طور پر غیر متبدل رہنے کے لئے وضع نہیں کی گئی تھیں ورنہ جہاں تک حضرت عمرؓ کے اس اجتہادی فیصلے کا تعلق ہے یہ قرآن کے خلاف ہے۔ اس لئے میں اس قسم کی روایات کو بنظر اشتباہ دیکھا کرتا ہوں لیکن روایت پرست حضرات اسے صحیح مانتے ہیں۔

دفاتر کا قیام، جیل خانوں کی تعمیر، سکوں کی ترویج وغیرہ۔ اس باب میں امام ابن قیم اپنی کتاب "الطرق الحکمیہ" میں ابن عقیل کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ

> سیاست کی تعریف یہ ہے کہ یہ وہ فعل ہے کہ جس کے ذریعے عوام اصلاح سے قریب ہو جائیں اور فتنہ و فساد سے دور۔ اگرچہ اس معاملہ سے متعلق نہ قرآن میں واضح حکم موجود ہو نہ حدیث میں۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ سیاست وہی ہے جس کی شرع نے وضاحت کر دی ہے یہ بات بالکل غلط ہے۔ خود صحابہ کرامؓ نے اس کی تغلیط کی ہے۔ سچ پوچھو تو اجتہاد رائے کا یہ سلسلہ عہد خلفائے راشدین سے چلا آرہا ہے۔ حضرت علیؓ نے جو زنادقہ کو جلایا۔ حضرت عثمانؓ نے قرآن کے جو غیر معمولی مصاحف کو جلایا۔ حضرت عمرؓ نے جو نصر بن حجاج کو جلا وطن کیا۔ یہ سب اگر اجتہاد رائے نہیں تھا تو اور کیا تھا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ خود نبی اکرمؐ نے جن جزئیات کو متعین فرمایا تھا ان کا دائمی طور پر ناقابل تغیر و تبدل رکھا جانا مقصود نہ تھا نہ ہی تمام کی تمام شریعت انہی میں محصور ہو چکی تھی۔ اسلامی حکومت اپنے اپنے زمانہ کے اقتضایات کے پیش نظر ان میں تبدیلیاں بھی کر سکتی تھی اور ان پر اضافے بھی۔ ناقابل تغیر صرف قرآن کے اصول اور اس کی متعین کردہ جزئیات تھیں (اور ہیں) چنانچہ جہاں ہمارے سامنے تو ان جزئیات میں تغیر و تبدل اور حک و اضافہ کے واقعات آتے ہیں جنہیں قرآن نے متعین نہیں کیا تھا، یا تو کتب تاریخ کے دامن میں محفوظ ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ لوگوں نے عورتوں کے مہر میں بہت اضافہ کر دیا ہے تو آپ نے چاہا کہ مہر کی کوئی حد متعین کر دی جائے۔ آپ نے مسجد میں لوگوں کے سامنے اپنی اس رائے کا اظہار کیا تو تو ایک کونے سے ایک عورت کی آواز آئی کہ عمرؓ! کیا کہہ رہے ہو؟ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ

وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا

اگر تم نے ان بیویوں میں سے کسی کو بہت سا مال دیدیا تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔

آپ نے سن کر کہا کہ اس عورت نے سچ کہا۔ عمر غلطی پر تھا۔ جس چیز کو قرآن نے مطلق چھوڑ دیا ہے اسے

مقید کس طرح کیا جاسکتا ہے؟

خلافت راشدہ میں ایسی مثالیں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں کہ ایک خلیفہ کے فیصلہ کے خلاف دوسرے خلیفہ نے فیصلہ دیا ہو۔ مثلاً

(۱) قرآن نے صدقات میں سے ایک حصہ مؤلفۃ القلوب کا بھی رکھا ہے لیکن یہ مرکز کے اختیار میں ہے کہ اس کا صیغہ کہاں تک اور کب تک مناسب ہے۔ نبی اکرمؐ نے اقرع بن حابس اور عینیہ بن حصن کو (جو امرائے قبائل میں سے تھے) ایک بار تالیف قلوب کے لئے سو سو اونٹ عطا فرمائے۔ پھر خلیفہ اول کے عہد میں انہوں نے کچھ زمینیں طلب کیں تو انہیں وہ بھی دیدی گئیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں اس اراضی کو یہ کہکر واپس لے لیا کہ اللہ نے اسلام کو تمہاری امداد سے بے نیاز کر دیا ہے اس لئے وہ زمینیں اب ان کے حقداروں کو دی جائیں گی۔

(۲) حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک مطلقہ عورت نے اپنی عدت کے زمانہ میں نکاح کر لیا (حالانکہ قرآن میں اس کی ممانعت آئی ہے)، اس پر حضرت عمرؓ نے اس کے شوہر کے کوڑے لگوائے اور فیصلہ صادر فرمایا کہ جو عورت اپنی عدت کے زمانہ میں نکاح کرے اگر اس کے شوہر کی اس کے ساتھ مقاربت نہیں ہوئی، تو دونوں میں علیحدگی کرا دی جائے گی۔ لیکن بعد میں یہ شوہر اس کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے۔ لیکن اگر مقاربت ہو چکی ہے تو اس علیحدگی کے بعد وہ اس سے نکاح نہیں کر سکیگا۔ لیکن حضرت علیؓ نے اس فیصلہ کے جزو ثانی سے اختلاف کیا اور فرمایا کہ بعد اختتام عدت۔ اس شوہر سے نکاح جائز ہوگا خواہ مقاربت ہوئی ہو یا نہ۔

(۳) حضرت عثمانؓ نے فیصلہ کیا تھا کہ آزاد عورت، غلام کی بیوی ہو کر صرف دو طلاقوں سے دائمی طور پر حرام ہو جائے گی۔ لیکن حضرت علیؓ نے اس فیصلہ کی مخالفت کی اور فرمایا کہ وہ تین طلاق سے کم میں حرام نہیں ہو گی۔

(۴) اگر کوئی مرد حالت مرض میں اپنی بیوی کو طلاق دیدے تو حضرت عمرؓ کے فیصلہ کے مطابق اسے متوفی کے ترکہ سے اسی صورت میں حصّہ ملیگا اگر اس کا خاوند عدت کے زمانہ میں فوت ہو جائے۔ اگر عدت کی مدت گذر جائے تو پھر متوفی کے ترکہ سے اسے کچھ نہیں ملے گا۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے فیصلہ دیا کہ اس باب میں حد مقرر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ بہر حال ترکہ کی مستحق ہوگی۔

(۵) جب حاملہ عورت کا شوہر مرجائے حضرت عمرؓ نے اس کی عدت وضع حمل مقرر کی ہے لیکن حضرت علیؓ کا فیصلہ ہے کہ وضع حمل اور چار مہینے دس دن کی مدت میں جو بھی مدت طویل ہوگی وہی اس کی عدت ہے۔

(۶) دادا کی موجودگی میں حضرت ابوبکرؓ بھائیوں کو وراثت نہیں دلواتے تھے لیکن حضرت عمرؓ نے ایسی حالت میں بھائیوں کو وراثت دلوائی۔

(۷) حضرت ابوبکرؓ لوگوں پر برابر برابر مال تقسیم کراتے تھے اور کسی کو کسی دوسرے پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ترجیحی حقوق قائم کئے اور فرمایا کہ جن لوگوں نے رسول اللہ کے خلاف جنگ کی ہے وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جو حضورؐ کے ساتھ شریک جہاد ہوئے۔ لیکن حضرت علیؓ نے پھر اس امتیاز کو مٹا دیا۔

اس قسم کے اور بہت سے واقعات کتب تاریخ و آثار میں مذکور ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ ایک خلیفہ کے زمانہ کی متعین کردہ جزئیات کو بھی ناقابلِ تغیر و تبدل نہیں سمجھا جایا کرتا تھا۔ ایک خلیفہ کا فیصلہ اس کے اپنے زمانہ کے لئے شریعت ہوتا تھا؛ اس کے بعد آنے والے کا فیصلہ اس کے زمانہ والوں کے لئے شریعت۔

~~~~~~ ۷ ~~~~~~

خلفائے راشدین کے بعد، خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہو گئی جس کا لازمی نتیجہ۔ دین اور دنیا کی تفریق تھا۔ رفتہ رفتہ صورت یہ ہو گئی کہ بادشاہوں نے رسمِ نام اپنا ابھی تک خلیفہ ہی رکھے تھے،
~~~~~~

"امور دنیا" کی سرانجام دہی کا فریضہ اپنے ذمہ رکھا اور "امور دینی" علمار کی جماعت کے سپرد ہوتے گئے۔ نتیجہ یہ کہ اسلامی نظام کا وہ اصل الاصول جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ بتدریج نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ شریعت کے جزئیات متعین کرنے کا فریضہ انفرادی نہیں بلکہ ملت کا اجتماعی منصب تھا جس کی تکمیل مجلس شوریٰ اور امیر ملت کے فیصلوں سے ہوتی تھی۔ اب نہ امیر ملت تھا نہ اس کی مجلس شوریٰ۔ اس لئے جزئیات کی تعیین کس طرح ہوتی؟ نتیجہ اس کا یہ کہ لوگ علمار کے پاس اپنے اپنے امور تنفیذ لاتے۔ وہ پہلے قرآن کی طرف نگاہ دوڑاتے۔ اگر اس کی متعین کردہ جزئیات سے بات طے ہو جاتی تو ہوالمراد ورنہ وہ عہد رسالتمآب اور خلافت راشدہ کے فیصلوں میں تفحص کرتے۔ اور اگر وہاں بھی مناسب حال کوئی فیصلہ نہ ملتا تو بجبوراً خاموش رہتے۔ اس ضرورت کے ماتحت نبی اکرمؐ اور عہد صحابہؓ کے احوال وکوائف اور اعمال واقوال کی جمع وتدوین کا خیال پیدا ہوا۔ ان ہی مجموعوں کا نام کتب روایات ہے چنانچہ ان میں سب سے پہلا مجموعہ جو آج ہمارے پاس ہے مؤطا امام مالکؒ ہے جو قریب ۱۵۰ھ میں مدون ہوئی۔ اس میں کم وبیش پانچ سو روایات ہوں گی جو بیشتر احکام ہی پر مشتمل ہیں۔ بنی عباس کے عہد حکومت میں، سلطنت بہت وسیع ہوگئی تو تمدن کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں نے نئے نئے مسائل پیش کر دیئے۔ جن کا حل روایات عہد رسالتمآبؐ اور خلافت راشدہ میں نہیں مل سکتا تھا۔ اور علمار حضرات کے لئے یہ بھی مشکل تھا کہ ہر نئے معاملہ میں خاموشی اختیار کرلیں۔ اس ضرورت کے ماتحت روایات وضع ہونی شروع ہوئیں اور سو سال کے عرصہ میں (کہ جس زمانہ میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم مدون ہوئی ہیں۔ یعنی نبی اکرمؐ کے قریب اڑھائی سو سال بعد) ان کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ ایک امام بخاریؒ نے چھ لاکھ احادیث جمع کیں اور ان میں سے قریب سات ہزار منتخب کرکے اپنا مجموعہ مرتب کیا۔ اس ضرورت علاوہ جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے وضع روایات کے لئے اور بھی بہت سے اسباب محرک و مؤید ہوئے لیکن یہ بحث میرے اس موضوع سے خارج ہے۔ مجھے اس وقت صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ دینی لامرکزیت سے جب جزئیات شرعیہ کی تعیین کا دروازہ بند ہوا تو لوگوں کو کس طرح مجبوراً سابقہ متعین شدہ جزئیات پر اکتفا کرنا پڑا اور جب وہاں سے ہر مسئلہ کا جواب نہ ملا تو ان روایات میں کس طرح اضافہ ہو

شروع ہو گیا۔

لیکن ان کے ساتھ، علماء کا ایک اور گروہ بھی تھا جس نے ایسے مقامات پر خاموش رہنے یا وضعی حدیثوں کی طرف رجوع کرنے کے بجائے۔ اس مشکل کا ایک اور حل سوچا۔ ان کے سامنے جب کوئی نیا سوال آتا تو وہ قرآن یا روایات کو سامنے رکھ کر قیاساً استنباط کرتے اور اس طرح اپنی فکر اور رائے سے مسئلہ پیش نظر کا حل متعین کر لیتے۔ گروہ اوّل اہلِ حدیث کے نام سے متعارف ہوا۔ اور گروہ ثانی اہل الرائے یا اہلِ فقہ کہلایا۔ اس مؤخر الذکر گروہ میں، امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد، امام ابو یوسف، بغداد کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے تو ان کی قابلیت و تفقہ سے، ان کی فقہ دولت عباسی کا رسمی قانون بن گئی۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس فقہ میں اور وسعت پیدا ہوتی گئی یہی وہ فقہ ہے جو فقہ حنفی کے نام سے متعارف ہے۔ واضح رہے کہ یہ فقہ، ملت کی مجلس شوریٰ اور ان کے منتخب کردہ امام، کے تفقہ فی الدین کے اجتماعی فیصلے نہ تھے جو عہد اولیٰ میں شریعت کی جزئیات بنتے تھے یہ ائمہ فقہ کے انفرادی تفقہ و تدبر کے نتائج تھے۔ جنہیں حکومت اپنے مقاصد کے ماتحت بطور قانون رائج کر دیا کرتی تھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب کسی قانون کے محرکات، خاص مقاصد و مصالح ہوں تو اس کا اصول سے دور ہٹ جانا مستبعد نہیں ہوتا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اس مجموعۂ فقہ میں، نہ معلوم کس کس گوشے کے فیصلے اور کون کون سے اسباب و عواطف کے تقاضا یا شامل ہوتے رہے۔ جو کچھ استبداد ملوکیت زندگی کے اور شعبوں میں کیا کرتا ہے وہی کچھ یہاں ہوا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ وضعی حدیثوں کی طرح فقہ کے مجموعہ فتاویٰ میں بھی ایسی ایسی چیزیں شامل ہو گئیں جو کھلے طور پر قرآن کے خلاف جاتی ہیں۔

اس طرح احادیث اور فقہ کے مجموعے مرتب ہوئے۔

زوالِ بغداد کے بعد، ملت کی دنیاوی مرکزیت بھی ختم ہو گئی اور تشتت و افتراق کی اس عالمگیر افراتفری میں دین، یکسر مذہب میں تبدیل ہو کر چند بے جان عقائد اور رسومات ظواہر کا نام رہ گیا۔

علماء نے اپنی عظمت قائم رکھنے کے لئے مختلف مراکز قائم کر لئے اور امت سے کہدیا گیا کہ وہ مذہب سے متعلق ہر معاملہ کے لئے ان ہی مراکز حقیقت کی طرف رجوع کیا کریں۔ اس طرح مسلمانوں میں خالص برہمنیت (Priest hood) قائم ہو گئی جو ان کی زندگی کے ہر اس شعبہ پر جو مذہب سے متعلق تھا پورے طور پر چھا گئی۔ اگرچہ ان علماء میں باہمی اختلافات بھی تھے اور مختلف فرقوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔ لیکن جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ یہ تمام جماعت اصولی طور پر دو گروہوں میں منقسم تھی۔ یعنی اہل حدیث، اور اہل الرائے یا اہل فقہ۔ ان دونوں گروہوں کی باہمی چپقلش و آویزش، ملت اسلامیہ کی بدبختی کی ایک مستقل داستان ہے۔ گروہ سازی کا خاصہ ہے کہ انسان ان امتیازات میں جن سے اس کا فرقہ دوسرے فرقہ سے متمیز ہو تاہے متشدد ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام تعصب ہے۔ یہی تعصب اختلافات کو مستقل اور دائمی حیثیت دے کر ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق کا موجب بن جاتا ہے۔ جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو اس کی زندگی کا ہر شعبہ انحطاط پذیر ہو جاتا ہے اور اس کا اثر خاص طور پر اس کی فکری صلاحیتوں پر پڑتا ہے۔ چونکہ قوم میں جدت افکار و قوت تخلیق باقی نہیں رہتی اس لئے وہ تقلید جامد کو مسلک زندگی قرار دے لیتی ہے اور اپنے اس افلاس فکر و نظر اور فقدان تدبر و اجتہاد کو اسلاف پرستی کے مقدس نقاب میں چھپا کر اپنے آپ کو دھوکا دے لیتی ہے۔ اسلاف پرستی کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ گزرے ہوئے زمانہ کو اپنے زمانہ سے مقدس و مزکی قرار دیا جائے اور اس طرح اپنے ماضی کو درخشندہ اور حال و مستقبل کو تاریک بتایا جائے۔ زوال بغداد کے بعد، یہ تمام خرابیاں ابھر کر سطح پر آ گئیں اور علماء نے امت کو یہ کہہ کر سلا دیا کہ

(۱) مذہب جو کچھ بننا تھا، بن چکا۔ جتنا کچھ سمجھا جانا تھا سمجھا جا چکا۔ اب اس میں نہ تغیر و تبدل ہو سکتا ہے نہ حک و اضافہ

(۲) یہ مذہب علماء کو اسلاف سے وراثت میں ملا ہے اس لئے اسے علماء ہی سمجھ سکتے ہیں۔

(۳) تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم مذہب کے ہر معاملہ میں علماء کی طرف رجوع کرو۔ اور ان کے فیصلے کو خدا اور رسول کا فیصلہ سمجھو۔

(۴) چونکہ عقل کو مذہب میں کوئی دخل نہیں اس لئے اگر علماء کا کوئی حکم تمہاری سمجھ میں نہ آئے تو اس کے سمجھنے پر اصرار نہ کرو۔

(۵) بزرگوں کے راستے پر آنکھ بند کرکے چلتے جاؤ کہ یہی وہ صراط مستقیم ہے جو تمہیں سیدھی جنت کی طرف لیجائے گی۔

(۶) یاد رکھو تمہارا زمانہ فسق و فجور کا زمانہ ہے اس میں گنہگار بستے ہیں۔ تمہارے اسلاف کا زمانہ علم و تقویٰ کا زمانہ تھا اس لئے تم گنہگار اس کے اہل ہی نہیں ہو کہ مذہب کے معاملات میں دخل دے سکو

ان لوریوں سے انہوں نے قوم کو سلا دیا اور اس طرح ان کے دل کی گہرائیوں میں اپنی مسانید برہمنیت کی عظمت بٹھا دی۔ واشربوا فی قلوبہم العجل

اب انہیں قوم کی طرف سے تو کسی حملہ کا تو خطرہ نہیں تھا البتہ ان کے اپنے باہمی اختلافات سے ایک دوسرے کی طرف سے خطرہ ضرور رہتا تھا۔ اس کے لئے انہوں نے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے عقائد میں شدت اور تعصب پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ ان کے متبعین، ان عقائد میں ذراسی لغزش یا تبدیلی کے خیال سے کانپ اٹھیں اور اس میں انہیں ایمان جاتا دکھائی دے۔ چنانچہ اہل فقہ کے مقابلہ میں احادیث کو عین اسلام بنانے کے لئے یہ عقائد وضع کئے گئے کہ

(۱) احادیث بھی دراصل منزل من اللہ ہیں۔ اس لئے کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وحی متلو (جس کی ہم قرآن میں تلاوت کرتے ہیں) اور دوسری غیر متلو جو احادیث میں ہے۔

(۲) جن باتوں کی صراحت قرآن میں نہیں ہے انہیں اللہ نے اس لئے مجمل چھوڑ دیا تھا کہ رسول اللہ اس اجمال کی تفصیل متعین کر دیں (اس طرح کتاب و دین گویا

دو مصنفوں کی مشترکہ تصنیف قرار دی گئی چنانچہ امام اوزاعی کا قول ہے کہ قرآن اس سے زیادہ حدیثوں کا محتاج ہے جس قدر کہ حدیثیں قرآن کی (دیکھئے مختصر جامع بیان العلم)

(۳) قرآن میں جہاں اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم ہے اس سے مراد قرآن اور احادیث کی اطاعت ہے۔ لہٰذا احادیث قرآن کی مثل (مثلہ معہ) ہیں اور قرآن ہی کی طرح ابدی طور پر ناقابلِ تغیر و تبدل۔ بلکہ قرآن کو حدیث منسوخ بھی کر سکتی ہے

(۴) جب یہ اعتراض کیا گیا کہ احادیث میں ایسی چیزیں بھی ملتی ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں تو یہ کہا گیا کہ حدیث قرآن پر قاضی ہے اور قرآن حدیث پر قاضی نہیں۔ یعنی اگر قرآن اور حدیث میں دو باتیں باہم متعارض معلوم ہوں تو حدیث کا حکم واجب التعمیل ہوگا۔ (ایضاً)

ان کے مقابلہ میں اہلِ فقہ بھی اپنے عقائد میں کم متشدد نہ تھے۔ ان کے نزدیک، امت کے لئے اب قرآن کا کوئی عملی فائدہ باقی نہ تھا۔ اس میں سے جو کچھ حاصل کرنا تھا وہ ائمہ فقہ نے حاصل کر کے اپنے مجموعۂ فتاویٰ میں جمع کر دیا۔ اب قرآن کی تلاوت فقط ثواب حاصل کرنے یا مُردوں کو بخشنے کے لئے رہ گئی۔ جو جزئیات قرآن نے متعین نہیں کی تھیں، انہیں ائمہ فقہ نے متعین کر دیا اور اب ان کی متعین فرسودہ جزئیات قیامت تک کے لئے ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں۔ نہ ان میں حک و اضافہ ہو سکتا ہے نہ ادل بدل۔ اس لئے کہ اب مزید اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ حالانکہ خود

لہ مثلاً قرآن نے زنا کی سزا سو درے مقرر کی ہے۔ لیکن احادیث میں شادی شدہ زانیوں کی سزا رجم (سنگسار) ہے جو قرآن پر خالص اضافہ ہے یا قرآن نے ہر شخص کو یہ حق دیا ہے۔ (بلکہ اللہ نے اسے فرض قرار دیا ہے) کہ وہ اپنے ترکہ کے لئے وصیت کرے۔ لیکن احادیث کہتی ہیں کہ وصیت صرف ایک تہائی مال میں ہو سکتی ہے اور وہ بھی وارثا کے لئے نہیں یا قرآن دین کے معاملہ میں جبر و اکراہ نہیں چاہتا۔ ہر شخص کو اجازت دیتا ہے کہ وہ جو عقیدہ چاہے اختیار کرے لیکن احادیث کی رو سے مرتد کی سزا قتل ہے۔ یا قرآن نے جنگی قیدیوں کے متعلق حکم دیا ہے کہ انہیں فدیہ لیکر چھوڑ دو یا احساناً۔ لیکن علمائے حدیث کے نزدیک جنگی قیدیوں کو قتل کر دینے اور غلام بنا لینے تک کا بھی حکم ہے۔ مسلمانوں میں غلامی آئی بھی روایات کے راستے سے ہے۔ قرآن نے اس کے سب راستے بند کر دیئے تھے۔

ائمہ فقہ کا بھی یہ منشاء نہ تھا کہ ان کے تفقہ کے نتائج اور استنباطات و اجتہادات کو ابدی طور پر ناقابلِ تغیر مان لیا جائے۔ ایک ہی نہج فکر کی فقہ کے مختلف ائمہ کے باہمی اختلافات اس پر شاہد ہیں کہ وہ اپنے قیاس و آراء کو کبھی منزہ عن الخطاء نہیں سمجھتے تھے۔ خود امام اعظمؒ اور ان کے شاگردان جلیل القدر، امام محمد اور امام یوسفؒ کے قیاسات و استنباطات میں اختلاف ہوتا تھا۔ پھر ان کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ قرآن و سنت ہی سے اخذ مسائل کرتے ہیں۔ لیکن ان کی فقہ میں ایسے ایسے فیصلے موجود ہیں جو قرآن کے بھی خلاف جاتے ہیں (اور اہلِ حدیث کے اعتراضات کی رو سے خود سنت کے بھی) مثلاً فقہ کی رو سے یتیم پوتے کو دادا کی وراثت سے کچھ نہیں ملتا (اس لئے کہ اس کا جرم یہ ہے کہ اس کا باپ، اُس کے دادا کی موجودگی میں کیوں مر گیا)، حالانکہ یہ فیصلہ قرآن کے خلاف ہے۔ یا غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق تمام احکام، حالانکہ قرآن نے غلامی کو سرے سے ختم ہی دیا تھا اور صرف ان غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق احکام دیئے تھے جو نزولِ قرآن کے وقت پہلے سے موجود تھے۔ یا مثلاً وراثت کے قانون میں عولؔ کا قاعدہ کہ جس سے انسان لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو (معاذ اللہ) حساب کے ابتدائی قواعد بھی معلوم نہ تھے۔

بہرحال، اس طرح احادیث اور فقہ، مستقل دین بن گئیں اور قیامت تک کے مسلمانوں کے لئے ناقابلِ تغیر و تبدل قرار پا کر، واجب العمل ٹھہر گئیں۔ اور ان کی اطاعت کا نام ہوا اللہ اور رسول کی اطاعت۔ حالانکہ ان سے مفہوم صرف یہ تھا کہ رسول اللہؐ کے زمانہ سے لے کر مختلف ادوار میں دین کو کس طرح سے سمجھا گیا اور شریعت کی جزئیات کی تعیین میں کیا کیا کوششیں ہوئیں۔ یعنی یہ دین نہیں بلکہ دین کی تاریخ تھیں۔

روایات کو دین بنا لینے سے ایک اور خرابی بھی ہوئی۔ نبی اکرمؐ عرب میں پیدا ہوئے اس لئے جس طرح آپ کی زبان عربی تھی اسی طرح آپ کی عام معاشرت اور طریق بود و ماند بھی وہی تھا جو اُس زمانہ کے عربوں کا تھا۔ اُس معاشرت میں جو جو خرابیاں ایسی تھیں جو اسلام کے خلاف

جاتی تھیں ان کی بیشک حضورؐ نے اصلاح فرمادی۔ لیکن اس کے بعد وہی تھا جو اُس زمانہ کے عربوں میں مروّج تھا۔ وضع قطع لباس اور اس کی نقل و حرکت۔ اسباب حرب و ضرب۔ غرضیکہ روزمرہ کے رہنے سہنے کے طریقے اور برتنے کی چیزیں وغیرہ سب اسی انداز کی تھیں جن کا اس زمانہ میں رواج تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں جب تک قانون کی کسی شق سے متصادم نہ ہوں، قانون کی حدود میں نہیں جکڑی جاتیں۔ اور ہر زمانہ کے معاشرتی انداز کے مطابق اختیار کی جاسکتی ہیں۔ آپ کے کوٹ کی لمبائی کتنی ہونی چاہیئے۔ آپ کو جوتا کس قسم کا پہننا چاہیئے۔ پانی کس قسم کے برتن میں پینا چاہیئے (گلاس میں یا پیالہ میں)، وقس علیٰ ہذا۔ یہ چیزیں دین میں داخل نہیں ہیں۔ لیکن جب روایات مرتب ہوئیں تو چونکہ وہ تاریخ تھیں عہد رسالتمآب (صحابہ کرامؓ کی، اس لئے اس قسم کے عام معمولات کی باتیں بھی ان میں آگئیں اور جب بعد میں روایات دین بن گئیں تو یہ چیزیں بھی جزو دین قرار پاکر قیامت تک کے لئے ناقابل تغیر سمجھ لی گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف معاملات کی دنیا میں قانونی جزئیات میں رد و بدل کرنے کا اختیار ملت سے سلب کر لیا گیا بلکہ روزمرہ کے معمولات میں بھی انہیں ایک خاص وضع کی معاشرت کا پابند کر دیا گیا۔ پاجامہ کتنا لمبا ہونا چاہیئے۔ (۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔) بالوں کی مانگ کس طرف نکالنی چاہیئے۔ مسواک کی لمبائی کتنی ضروری ہے۔ غسل کے لئے کتنے لوٹے پانی چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ نتیجہ یہ کہ وہ دین جسے زمانہ کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ پھیلتے چلے جانا تھا، ظواہر پرستیوں (Ritualism) کا ایسا سخت مجموعہ بن گیا جس میں کہیں لوچ اور لچک نہیں۔ کسی مولوی صاحب کو معلوم ہو جائے کہ میت کے غسل کے پانی میں بیری کے پتے نہیں ڈالے گئے، تو وہ جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیگا۔ یہودیوں کے تالمود کو اٹھایئے۔ ہندوؤں کے شاستروں کو دیکھئے۔ ایک ایک رسم کی ادائیگی میں کتنی کتنی جانکاہ پابندیاں لگائی گئی ہیں۔ ان کے ہاں مذہب کی کوئی رَدا بھی ناجائز نہیں سکتی جب تک تو من تیل نہ ہو" قرآن نے حضورؐ کی بعثت کا مقصد مقدس یہ بتایا ہے کہ ویضع عنہم اصرھم والاغلال التی کانت علیہم (۷/۱۵۷)، کہ وہ رسولِ کافۃ للناس۔ انسانوں کی

ان کے نیچے وہ دبے ہوئے تھے۔ اور وہ طوق وسلاسل اتار کر پھینک دیگا تھے۔ یہ طوق وسلاسل، ملوکیت کا استبداد اور برہمنیت (Preisthood) کی رسوم پرستیاں تھیں۔ حضورؐ نے ان اطواق وسلاسل کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا لیکن مسلمانوں نے ان بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے مژگانِ عقیدت سے اکٹھا کیا اور اپنے احبار ورہبان کے مقدس ہاتھوں بصد سے اپنی گردنوں میں ڈال لیا اور ان غیر فطری قیود کا نام دین قرار دے لیا۔ یہ دین، بھلا زمانہ کے پھیلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ کس طرح دے سکتا تھا؟ نتیجہ یہ کہ جو مسلمان ان قیود سے تنگ آئے انہوں نے ان اطواق وسلاسل کو اس زور سے اتار کر پھینکا کہ ان کے ساتھ ہی حبل اللہ (اللہ کی رسی۔ قرآن) کا قلادہ بھی ان کی گردنوں سے نکل گیا۔ سو آج مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ وہ قفس کی تیلیوں میں جکڑے ہوتے ہیں تو ایسے کہ انہیں آزادی کی فضا میں ایک سانس تک لینا ـــ نصیب نہیں اور اگر آزاد ہوتے ہیں تو ایسے کہ فضا کی پہنائیوں میں اڑ رہے ہیں اور آشیانہ کہیں میسر نہیں۔

~~~~~~~

یوں وہ فروعات وجزئیات جنہیں ابدی طور پر ناقابلِ تغیر رکھنا نہ منشائے خداوندی تھا نہ مقصودِ رسالت، دین بن گئیں۔ چنانچہ یہ سلسلہ اس وقت تک چلا آرہا ہے۔ وہی فرقہ بندیاں۔ وہی گروہ سازیاں، وہی عملی برہمنیت (Priest hood) اور وہی ان کی اسلاف پرستی۔ وہی تقلید جامد اور وہی اس کے افسردہ نتائج۔ کسی معاملہ میں اہلِ حدیث حضرات سے پوچھئے تو وہ کہدیں گے کہ بخاری میں یوں آیا ہے۔ مسلم کی روایت یہ ہے۔ اور کسی اہل فقہ سے پوچھئے تو جواب ملے گا کہ المبسوط میں یہ لکھا ہے۔ اور شامی میں یوں آیا ہے عالمگیری کا یہ فتویٰ ہے۔ فلاں امام کا یہ قول ہے۔ کوئی یہ نہیں کہے گا کہ قرآن نے یہ حکم دیا ہے۔ اس لئے کہ قرآن سب کے نزدیک ساقط العمل ہو چکا ہے اور اس لئے مجبور دمحجوب۔ اسی اشخاص پرستی سے تنگ آکر بعض لوگوں نے رجعت الی القرآن کی آواز
~~~~~~~

بھی اٹھائی لیکن چونکہ یہ چیز ان کی نگاہوں سے بھی اوجھل تھی کہ قرآن نے جن جزئیات کو متعین نہیں کیا انہیں کس طرح سے متعین کیا جائے گا۔ اس لئے وہ اس اعتراض سے گھبرا کر کہ اگر قرآن ہی دین کی تکمیل کے لئے کافی ہے تو اس میں سے فلاں فلاں بات کی تفصیل نکال کر دکھاؤ۔ لگے قرآن سے ان جزئیات کو بھی متعین کرنے جن کے اس نے صرف اصول دیئے تھے وہ اس کوشش ناکام و ناصواب میں ایسے الجھے کہ ٹھکانے کی بات کچھ بھی نہ کر سکے اور خود ایک فرقہ (اہل قرآن) بن کر بیٹھ گئے۔

اسے پھر سن لیجئے کہ:۔

(۱) قرآن نے جن جزئیات کو خود متعین کر دیا ہے وہ قیامت تک کے لئے ناقابل تغیر و تبدل ہیں (اور ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے)

(۲) باقی امور کے لئے اس نے اصول مقرر کئے ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے، ہر زمانہ کی حکومت اسلامی (یاد رکھئے، افراد نہیں بلکہ حکومت جو قرآنی اصول جمہوریت و مشاورت کی رو سے قائم کی جائے) اپنے زمانہ کے مقتضیات کے مطابق، عقل کی روشنی میں، ان کی جزئیات خود متعین کرے گی۔ اور یہی جزئیات اس زمانہ کے لئے نظام شریعت قرار پا جائیں گی۔ ان جزئیات کی تعیین میں، ہر زمانہ کی حکومت، ان کوششوں کو بھی سامنے رکھے گی جو اس سے قبل مختلف ادوار کی اسلامی حکومتوں نے (اور مختلف افراد نے) اس باب میں کی ہیں۔ اس بنا پر مجموعہ احادیث اور کتب فقہ سے بطور نظائر (Precedents) فائدہ حاصل کیا جائے گا۔ ان میں جو باتیں قرآنی اصولوں کے مطابق ہوں گی اور موجودہ زمانہ کے تقاضے ان میں تغیر و تبدل کے متقاضی نہ ہوں گے، وہ علی حالہ رکھ لی جائیں گی۔ باقی خود متعین کر لی جائیں گی۔

مذہب کو ایک پرائیویٹ حیثیت دے کر اسے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کے ہاتھوں میں سونپ دینے کا جو سلسلہ دینی لامرکزیت اور ملت کا شیرازہ بگڑنے کے زمانہ سے شروع ہوا تھا وہ آج تک جاری ہے۔ خود اپنے زمانہ میں دیکھئے۔ دنیا میں متعدد "اسلامی سلطنتیں" موجود ہیں۔ لیکن ہر جگہ دین اور دنیا کی ثنویت (Dualism) کا نظام کارفرما ہے۔ حکومت بادشاہوں کے ہاتھ میں ہے اور مذہب علماء کے تسلط میں، اور دونوں کا استبداد عوام کے اذہان و قلوب پر مسلط۔ چونکہ ان کے مفاد مشترک ہیں۔ اس لئے ان دونوں میں اس قسم کی ملی بھگت ہے جس طرح کھشتری راجاؤں اور برہمنوں میں ہوتی تھی۔ راجہ، برہمنوں کی رکھشا (حفاظت) کرتے تھے۔ اور برہمن، راجاؤں کو اشیرباد (سلامتی کی دعائیں) دیتے تھے اور دونوں مل کر عوام کو محکومیت کے آہنی پنجے میں جکڑے رکھتے تھے۔ یہی حالت ہمارے ہاں کی ملوکیت میں تھی۔ بادشاہ علماء کو قاضی اور مفتی بنا دیتے تھے۔ اور علماء، بادشاہوں کو ظلِ اللہ بتا کر خطبوں میں ان کے نام درود و صلوٰۃ کے ساتھ لیتے تھے، اور عوام بیچارے ان دونوں کے تغلب و استبداد کے نیچے کچلے جاتے تھے۔ یہی سلسلہ اب تک جاری ہے۔ غضب خدا کا۔ آج دنیا میں شخصی حکومتیں کہیں باقی نہیں رہیں، بجز مسلمانوں کی حکومتوں کے۔ جس طرح بردہ فروشی کہیں باقی نہیں ہے، بجز مکہ کی گلیوں کے، غور کیجئے۔ یہی علماء ایک طرف ہمیں بتاتے ہیں کہ وہ جرمِ عظیم جس کی وجہ سے یزید مستحقِ لعنت سمجھا جاتا ہے یہ ہے کہ اس نے سلطنت کو باندازِ جمہوریت حاصل نہیں کیا بلکہ باپ سے وراثتاً پایا اور اس طرح خلافت کو ملوکیت میں بدل[1] دیا۔ لیکن دوسری طرف خود ان ہی علماء کی یہ حالت ہے کہ بنی امیہ سے لیکر آج تک، ان تمام بادشاہوں کی جنہوں نے سلطنت کو یزید ہی

---

[1] احادیث میں یزید کے متعلق بھی عجیب چیز ملتی ہے۔ بخاری کی حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) پر حملہ کرے گا۔ بخشا ہوا ہے (مغفور لھم) اور طبری کا بیان ہے کہ جس پہلے لشکر نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا ہے اس کے ایک دستہ کا سپہ سالار خود یزید تھا۔

کی طرح وراثتاً حاصل کیا تھا اور آج بھی جو اسی طرح تخت و تاج کے مالک بنے بیٹھے ہیں، علماء کی طرف سے تائید و محافظت حاصل رہی ہے۔ بادشاہ ان کی پرورش کرتے تھے اور یہ بادشاہوں کے تخت و تاج کی حفاظت کرتے تھے۔ اور آج تک یہی سلسلہ جاری ہے۔ قرآن کا نظام نہ وہ نافذ کرنا چاہتے ہیں نہ یہ۔ اس لئے کہ اس نظام میں نہ ملوکیت باقی رہ سکتی ہے نہ ملائیت (priesthood) قرآن ان دونوں کا خاتمہ کر دیتا ہے اور خدا اور بندے کے درمیان کسی واسطہ کو باقی نہیں رہنے دیتا۔ اطاعت صرف ایک خدا کی اور بس۔ اور اس کا ذریعہ ملت کے منتخب کردہ بہترین افراد پر مشتمل مجلس شوریٰ اور ان میں کا بہترین منتخب کردہ امام جو قرآن کے قانون کو دنیا میں نافذ کر دے۔ یہ نظام، جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، ان حکومتوں میں نافذ نہیں ہو سکتا جن پر اس وقت مسلمان بادشاہوں کا تسلط ہے اور جن کی محافظت علماء کے اوراد و فتاویٰ سے ہو رہی ہے۔ اس نظام کے نفاذ کا اگر کہیں امکان ہے تو پاکستان کی سرزمین میں ہے اس لئے کہ یہاں ابھی شخصی ملوکیت کا تغلب نہیں ہوا۔ اس میں جس انداز کی حکومت ہم چاہیں رائج کر سکتے ہیں۔ لہٰذا پاکستان کا خطۂ ارض ایک تجربہ گاہ ہے جس میں قرآن کا وہی نظام جو سب سے پہلے محمد رسول اللہ والذین معہٗ (علیہم التحیۃ والسلام) کے مقدس ہاتھوں سے سرزمین حجاز میں نافذ ہوا تھا یار دگر رائج ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ کام یہاں ان لوگوں کے سپرد ہو گیا جو ان جزئیات کو ناقابل تغیر و تبدل سمجھتے ہیں جو کہیں ہزار برس پہلے، اس زمانہ کی تمدنی ضروریات کے پیش نظر، وضع کی گئی تھیں، یعنی ہمارے تنگ نظر علماء کرام۔ تو یہاں بھی دو صورتوں میں سے ایک صورت ناگزیر ہو گی۔ یعنی

(۱) جو نظام یہ حضرات پیش کریں گے وہ ناممکن العمل بھی ہو گا اور بیحد متنازعہ فیہ۱،

---

۱ متنازعہ فیہ کا اندازہ اس سے لگایئے کہ علماء کا تمام گروہ دس ہزار برس میں اس کا فیصلہ نہیں کر سکا کہ نماز میں ہاتھ کھلے چھوڑنے چاہئیں یا باندھنے۔ اور اگر باندھنے چاہئیں تو کس جگہ۔ ان سے یہ توقع رکھنا کہ کوئی متفق علیہ ضابطۂ آئین تیار کر دیں گے اپنے آپ کو فریب دینا ہے۔ پورا نظام تو ایک طرف یہ تو کسی ایک مسئلہ کا بھی متفق علیہ جواب نہیں دے سکتے۔ شیعہ کا جواب اور سنی کا اور، مقلد کا اور، غیر مقلد کا اور۔ ان کے ہاتھ میں نظام شریعت کی تدوین کا کام

اس لئے قوم سرے سے دینی نظام ہی سے اظہار برأت کر دے گی۔ اور ترکوں
کی طرح حکومت کی بنیاد خالص دنیاوی قوانین پر رکھ لے گی۔ اور یا
(۲) وہ پارٹی جس کے ہاتھ میں زمام اقتدار و حکومت ہو گی۔ ان سے مصالحت
کر کے مذہب ان کے سپرد کر دے گی اور ان کی عباؤں اور قباؤں کے سایہ میں
اپنی من مانی حکومت چلائے گی۔ اس طرح علماء کی سیادت بھی قائم رہے گی
اور ارباب قوت کی قیادت بھی۔ لیکن دین کا قیام نہ اس صورت میں ہو سکے گا نہ
اس صورت میں۔

اب آپ نے اندازہ فرما لیا ہو گا کہ میں نے جب یہ بحث چھیڑی تھی کہ فقہ یا روایات قیامت تک کے لئے ابدی دین نہیں بن سکتیں تو وہ محض نظری مباحثہ نہ تھا بلکہ ایک حتمی عملی نتیجہ کی طرف دعوت دینے کی تحریک تھی۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ارباب فکر و نظر سوچیں کہ وہ چاہتے ہیں کہ جو غلط نظام، دین کے نام سے، مسلمانوں پر اتنی صدیوں سے مسلط چلا آ رہا ہے اور جس نے ان کی حالت یہ کر دی ہے کہ

بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

وہی نظام اب آزاد پاکستان میں ان پر مسلط کر دیا جائے۔ یا وہ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ نے جب انہیں یہ آزاد خطہ زمین موہبت فرمایا ہے تو اس میں پھر سے اس نظام کو رائج کیا جائے جسے چشم فلک نے ایک مرتبہ دیکھا اور دوبارہ دیکھنے کے لئے وہ آج تک سرگرداں ہے۔ اس نظام قرآنی کی تشکیل و ترویج کچھ مشکل نہیں۔ قرآن کی تعلیم بڑی واضح، بین اور تضاد و تعارض سے پاک ہے۔ وہ عقل انسانی کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور ہر زمانہ کے انسانوں کو آزادی بخشتا ہے کہ وہ اس کے مقرر اصولوں کی روشنی میں اپنے فہم و تدبر سے اپنے لئے آپ قانونی جزئیات مرتب کریں۔ اس سے زیادہ آسان اور عقل انسانی کے عین مطابق۔ اور کونسا نظام ہو گا؟ کہ

نہ جس میں عصر رواں کی حیا سے بیزاری   نہ جس میں عہد کہن کے فسانہ و افسوں

حقائقِ ابدی پر مدار ہے جس کا وہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطون
طلوع ہے صفتِ آفتاب جس کا غروب یگانہ اور مثالِ زمانہ گوناگوں
عناصر اس کے ہیں، روح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حسنِ طبیعت عرب کا سوزِ دروں

میں جانتا ہوں کہ اس دعوت کی مخالفت ہوگی۔ اس لئے نہیں کہ اس میں کوئی ایسی بات ہے جو دین کے خلاف ہے بلکہ اس لئے کہ اس سے ہمارے "ارباب شریعت" کو اپنی عظمت و عقیدت کی مسندیں چھننے کا خوف ہے۔ ان میں بیشتر ایسے ہیں جو نظام شرعی کی تنفیذ و ترویج کا مطالبہ ہی اس لئے کرتے ہیں کہ اختیار و اقتدار ان کے ہاتھ میں رہے۔ لیکن وہ عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کیلئے یہ کہہ کر اس دعوت کی مخالفت کریں گے کہ لیجئے! یہ ایسا نظام وضع کرنا چاہتے ہیں جس میں رسول اللہؐ کی حدیثوں ہی سے انکار ہو رہا ہے۔ حالانکہ اس نظام میں حدیثوں سے انکار نہیں بلکہ انہیں ان کے اس مقام پر رکھنا ہے جو مقام خود منشائے رسالتؐ تھا۔ رسول اللہ کا یہ منشا کبھی نہ تھا کہ حضورؐ کے ہنگامی اور وقتی فیصلے قیامت تک کے لئے ناقابلِ تغیر سمجھ لئے جائیں۔ اگر حضورؐ کا یہ منشا ہوتا تو جس طرح قرآن کو لکھوا کر بحفاظت ملت کے سپرد کر گئے تھے اپنی متعین فرمودہ جزئیات کا مجموعہ بھی اسی طرح لکھوا کر بحفاظت ملت کو دے جاتے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ حدیثوں کے جو مجموعے ہمارے پاس موجود ہیں ان میں سے کسی مجموعہ کے متعلق بھی کوئی شخص قطعی اور حتمی طور پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ فی الواقعہ رسول اللہؐ ہی کا ارشاد ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، احادیث کا صحیح ترین مجموعہ، بخاری کو سمجھا جاتا ہے۔ یہ احادیث امام بخاریؒ نے رسول اللہؐ سے دو اڑھائی سو سال بعد، لوگوں کی زبانی سن کر جمع کیں۔ اڑھائی سو سال کے عرصہ میں سنی سنائی باتیں جس قدر قابلِ اعتماد رہ سکتی ہیں، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ حالانکہ صورت یہ تھی کہ حضورؐ کے بہت بعد نہیں بلکہ خود صحابہؓ کے سامنے ایسی احادیث آجاتی تھیں جنہیں وہ دیکھتے

تھے کہ قرآن کے خلاف ہیں اس لئے وہ انہیں رد کر دیتے تھے۔ مثلاً فاطمہ بنت قیس کی روایت کہ طلاق بائنہ پائی ہوئی عورت کے لئے شوہر کے ذمہ نہ مکان ہے نہ نفقہ، جب حضرت عمرؓ کے سامنے آئی تو آپ نے یہ کہکر اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ قرآن کے خلاف ایک عورت کی بات کیسے مان لی جائے۔ حضرت ابن عمرؓ نے جب یہ روائی حدیث بیان کی کہ مردے سنتے ہیں تو حضرت عائشہ نے فرمایا کہ اللہ ابن عمرؓ پر رحم کرے۔ قرآن میں صاف لکھا ہے کہ مردے نہیں سن سکتے۔ اسی طرح جب آپ کے سامنے یہ حدیث بیان کی گئی کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ مردہ پہ اس کے گھر والوں کے نوحہ کرنے سے عذاب ہوتا ہے تو آپ نے کہا کہ یہ حدیث غلط ہے کیونکہ قرآن میں ہے کہ ایک کا گناہ دوسرا نہیں اٹھائے گا۔ سو جب خود صحابہؓ کے زمانہ میں اس قسم کی احادیث مروج ہو گئی تھیں تو اڑھائی سو سال کے عرصہ میں ان کی جو کیفیت ہو گئی ہو گی وہ ظاہر ہے۔ بالخصوص جب اس حقیقت کو بھی سامنے رکھا جائے کہ نادانستہ نہیں بلکہ خاص مقاصد کے ماتحت جھوٹی حدیثیں اس کثرت سے وضع کی جایا کرتی تھیں کہ پناہ بخدا۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ عبدالکریم ابن ابی العوجاء کو قتل کرنے کے لئے بھیجا گیا تو اس نے کہا کہ میں نے چار ہزار احادیث جن میں حرام اور حلال کے احکام ہیں، وضع کر کے لوگوں میں پھیلادی ہیں۔ یہ ایک مثال ہے۔ اس قسم کے ہزاروں واضعین احادیث اس عرصہ میں پیدا ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے صحیح ترین مجموعوں میں بھی ایسی ایسی حدیثیں ملتی ہیں جن پر دین ہنستا ہے اور عقل روتی ہے۔ کہیں ان میں ہے کہ حضرت موسےٰ کے پاس جب ملک الموت آیا تو آپ نے اس کے ایسا تھپڑ مارا جس سے اس کی آنکھ باہر نکل پڑی۔ یا حضرت موسےٰ اپنے کپڑے ایک پتھر پر رکھ کر نہا رہے تھے کہ پتھر کپڑے لیکر بھاگ اٹھا اور آپ اس کے پیچھے برہنہ بھاگے۔ یا یہ کہ حضرت سلیمانؑ نے ایک رات میں نوے بیویوں سے مقاربت کی۔ یا یہ کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین مرتبہ جھوٹ بولا۔ اور کہیں اس قسم کی احادیث کہ جس سے خود شان نبوت پر ہی طعن آجاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ آپ پر کسی نے جادو کر دیا تھا جس سے آپ کو نسیان ہو گیا تھا۔ یا حضورؐ نے پیٹ کی بیماری میں اونٹوں کا پیشاب پینے کا

حکم دیا اور قتل کے جرم میں ہاتھ پاؤں کاٹ کر ان کی آنکھوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا اور وہ پیاس سے تڑپ رہے تھے لیکن انہیں پانی نہیں دیا جاتا تھا۔ یا اس قسم کے اساطیر کہن (Mythology) کی باتیں کہ حضرت آدمؑ کا قد ساٹھ گز کا تھا۔ جبرئیلؑ و میکائیلؑ جنگ بدر میں سفید کپڑے پہنے ہوئے حضورؐ کی طرف سے لڑتے تھے۔ شیطان، حضرت ابو ہریرہؓ کی محافظت میں رکھے ہوئے مال کو چرانے آتا تھا اور آپ اس کی بہانہ سازیوں پر یقین کر کے اسے چھوڑ دیتے تھے۔ رسول اللہؐ کے زمانہ میں بیل اور بھیڑیا انسانوں کی طرح باتیں کیا کرتے تھے۔ مرغ جب بولتا ہے تو فرشتے کو دیکھتا ہے اور گدھا بولتا ہے تو شیطان کو دیکھتا ہے۔ یا حضرت ابن عمرؓ کے پاس ریشم کا ایک ٹکڑہ تھا، آپ جہاں جنت میں پہنچنے کا ارادہ کرتے وہ اڑا کر پہنچا دیا کرتا تھا۔ یا رسول اللہؐ کو ایک درخت نے بتایا کہ جنات آپ سے قرآن سن کر گئے ہیں۔ یہ سب حدیثیں بخاری شریف میں موجود ہیں۔ اور یہ تو یونہی چند مثالیں ہیں۔ حدیثوں کے تمام مجموعے اس قسم کی حدیثوں سے بھرے پڑے ہیں۔ حدیثوں کے اس قدر ظنی ہونے ہی کی وجہ تھی کہ امام ابو حنیفہؒ ان احادیث کو بھی مسترد کر دیا کرتے تھے جو قیاس صحیح کے خلاف ہوں۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ جب سفر میں جاتے تو قرعہ ڈالتے اور ازواج مطہرات میں جس کے نام کا قرعہ نکلتا انہیں ساتھ لے جاتے۔ امام اعظمؒ نے یہ کہکر اس سے انکار کر دیا کہ قرعہ اندازی تو اصولاً قمار بازی ہے۔ اس لئے اس حدیث کو کیسے صحیح مان لیا جائے۔ یا مثلاً جب کسی نے کہا کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جب تک بائع اور مشتری جدا نہوں انہیں بیع کے فسخ کرنے کا حق رہتا ہے۔ امام اعظمؒ نے یہ کہکر اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ اگر یہ دونوں ایک ہی قید خانہ میں ہوں یا ایک ہی جہاز میں سفر کر رہے ہوں تو اس صورت میں بیع پختہ ہی نہیں ہو سکے گی۔ وقس علیٰ ہذا۔ قیاس صحیح مصالح قرآنی کی بناء پر احکام میں اجتہاد کی تو ایسی صورتیں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اس باب میں صحابہؓ نے دین کی اس بلم کو کس قدر صاف طور پر سمجھا تھا۔ قرآن میں چوری کی سزا قطع ید ہے۔ لیکن اس کا تعین نہیں کہ چور کسے کہا جائے گا۔ ایک مرتبہ قحط پڑا اور کچھ لوگوں نے بھوک سے مجبور ہو کر

چوری کر لی۔ حضرت عمرؓ نے انہیں قطعِ ید (ہاتھ کاٹ دینے) کی سزا نہیں دی۔

میں نے ان مثالوں کو اس لئے بیان کیا ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ نظامِ اسلامی کی تدوین کے لئے جس مسلک کی طرف میں نے دعوت دی ہے اس میں احادیث کو ان کے اصلی مقام پر رکھا جائے گا۔ اس لئے اس باب میں غلط پروپیگنڈا سے متاثر ہو کر راہِ حق و صداقت کو چھوڑ نہیں دینا چاہیئے۔

ان تصریحات کے پیشِ نظر کرنے کا کام یہ ہے کہ مجلسِ دستور ساز ملت کے منتخب کردہ اربابِ فکر و نظر کی ایک ایسی کمیٹی متعین کرے جس میں ماہرینِ قوانین و دساتیرِ عالم اور وہ حضرات شامل ہوں جو قرآن و تاریخِ دین پر غائر نگاہ رکھتے ہوں۔ ماہرینِ قوانین یہ تجویز کریں کہ پاکستان کی حکومت کے لئے کون کون سی شقوں پر مشتمل ضابطۂ قانون کی ضرورت ہے۔ پھر قرآن اور تاریخِ دین جاننے والے حضرات اس خاکہ کو سامنے رکھ کر غور کریں کہ

(۱) ان میں کون کون سی باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق قرآن نے فروعات و جزئیات تک متعین کر دی ہیں۔ اور

(۲) کون کون سی ایسی جن سے متعلق صرف اصولی حکم دیا ہے۔

شقِ ثانی کے متعلق وہ غور کریں کہ اس قسم کے مسائل اس سے پیشتر نبی اکرمؐ کے زمانہ سے لیکر بعد تک کبھی سامنے آئے ہیں۔ اور اگر آئے ہیں تو ان کے متعلق کیا روش اختیار کی گئی۔ پھر یہ دیکھا جائے کہ وہ روش کیا آج بھی نافذ العمل ہو سکتی ہے۔ یا موجودہ زمانہ کے مقتضیات اس میں تغیر و تبدل چاہتے ہیں۔ اگر اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہ ہو تو اسے علیٰ حالہ رہنے دیا جائے ورنہ اس میں حسبِ اقتضاآتِ زمانہ مناسب رد و بدل کر دیا جائے۔ اس رد و بدل میں یہ اصل ہر وقت پیشِ نظر رہے کہ کوئی فرع، قرآن کی اصل سے کہیں متعارض نہ ہو۔ یہ مجموعہ قوانینِ ملتِ اسلامیہ پاکستانیہ کا ضابطہ نظامِ شریعت ہو گا اور اس میں مزید ضروریات کے

ماتحت مناسب حال تغیر و تبدل ہوتا رہے گا۔ یہ فریضہ تمام ملت کا مشترکہ ہے جب ملت اپنے منتخب کردہ حضرات کے سپرد کرے گی۔ اس میں کسی خاص جماعت کی اجارہ داری نہیں ہو گی۔ قوانین شریعت یا ان کی تعبیر و تفسیر، افراد کے ذمہ نہیں رکھی جائے گی اس لئے "پرائیویٹ علماء" کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ قوانین کی ترتیب و تدوین بھی اصولِ جمہوری کے ماتحت، ملت کا مشترکہ فریضہ ہو گا اور ان کی تنفیذ و ترویج یا تعبیر و تفسیر (Interpretation) بھی ملت کی قائم کردہ حکومت ہی کے ذمہ ہو گا۔ وہی کا فیصلہ فتویٰ کہلائے گا۔

مجھے تسلیم ہے کہ یہ تجربہ چونکہ ایک مدت کے بعد دہرایا جا رہا ہے اس لئے شروع شروع میں جو قانون بنے گا اس میں شاید خامیاں رہ جائیں۔ لیکن ان خامیوں سے گھبرانا نہیں چاہیے ہمارا یہ قدم صحیح راستے پر ہو گا اور آہستہ آہستہ تجربہ کے بعد، یہ خامیاں بھی رفع ہوتی جائیں گی۔ اور پھر ایک دن ہم ساری دنیا کو یہ کہنے کے قابل ہو جائیں گے کہ یہ ہے وہ نظامِ زندگی جسے خالقِ کائنات نے فطرت انسانیہ کی نشو و نمو کے لئے متعین فرمایا تھا اور جو ارتقائے شرف انسانیت کے لئے واحد اور مکمل ضابطہ حیات ہے۔ یہ وہ دن ہو گا "جب زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی" واشرقت الارض بنور ربھا۔ اور ہر دیکھنے والا پکار اٹھے گا کہ

برخیز کہ آدم را، ہنگامِ نمود آمد
ایں مشتِ غبارے را، انجم بہ سجود آمد

جیسا کہ شروع میں لکھا گیا ہے۔ میں نے اس مضمون میں "اسلامی نظام" کی افادیت، ہمہ گیریت، فوقیت اور افضلیت سے بحث نہیں کی۔ اس لئے کہ یہ پہلو موضوعِ پیشِ نظر سے خارج ہے۔ اس وقت مجھے صرف اتنا بتانا ہے کہ اسلامی نظامِ شریعت سے مفہوم کیا ہے اور اس کی ترتیب و تشکیل کس طرح عمل میں آئے گی۔ یہ نظام کیا نتائج پیدا کرے گا اور وہ نتائج کس طرح سے مترتب ہوں گے۔ یہ ایک جداگانہ بحث ہے۔ جسے ہم کسی دوسرے وقت

پر انحصار رکھتے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ، ایک نکتہ واضح طور پر ہمارے سامنے آگیا ہے۔ اور وہ یہ کہ اس نظام میں کس طرح انسانی عقل کو اس کا صحیح مقام عطا کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر صرف اس ایک جہت سے ہی دیکھا جائے تو بھی اسلامی نظام کی عظمت نمایاں طور پر سامنے آجاتی ہے۔ جب سے شعور انسانی نے آنکھ کھولی ہے، مذہب اور عقل کی کشمکش ہمیشہ اس کے سامنے رہی۔ دنیائے مذہب نے ہر بار یہی پکارا کہ اس میں عقل کو کوئی دخل نہیں۔ اس کی حدیں ماورائے سرحدِ ادراک سے شروع ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس عقل کو ہمیشہ یہی دعویٰ رہا کہ انسانی زندگی کے فیصلوں کا حق صرف اسی کو حاصل ہے۔ وہ اپنے اس حق میں کسی اور کی شرکت گوارا نہیں کرسکتی اور نہ ہی اس پر کسی قسم کی پابندیاں عائد کی جاسکتی ہیں۔ انسانیت کی تاریخ میں قرآن ایک ایسا سنگ میل ہے جہاں سے فی الواقعہ ایک نئے انداز زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس نے عقل اور مذہب کی صحیح حدود متعین کرکے ان میں اس قسم کی یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا کی ہے کہ وہ دو متضاد و متخاصم عناصر ہونے کے بجائے ایک دوسرے کے معاون و رفیق بن گئے ہیں۔ قرآن کے اوراق کو الٹتے جایئے شروع سے اخیر تک آپ دیکھیں گے کہ وہ عقل و بصیرت، فہم و فراست، علم و دانش، تدبر و تفکر کو کس طرح وجہ شرف و تکریم قرار دیتا ہے۔ وہ مخاطب ہی عقل کو کرتا ہے۔ اس کے نزدیک صاحبان دانش و بینش اولی الابصار و اولی الالباب ہی وہ لوگ ہیں جو اس کے پیغام کو سمجھنے اور اسے بروئے کار لانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو وہ "بدترین خلائق" قرار دیتا ہے۔ اِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۸:۲۲﴾ (یقیناً اللہ کے نزدیک سب سے بدتر حیوان وہ (انسان) ہیں جو بہرے اور گونگے بنے رہتے ہیں اور عقل سے کچھ کام نہیں لیتے) اس کے نزدیک ایسے انسان اس قابل ہی نہیں کہ انہیں انسانوں کے زمرہ میں شامل کیا جائے۔

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا

ولهم اعين لا يبصرون بها ولهم اذان لا يسمعون بها اولٓئك كالانعام بل هم اضل اولٓئك هم الغافلون ۝ (۷/۱۷۹)

کتنے ہی جن و انس ہیں جنہیں ہم نے جہنم کے لئے پیدا کیا ہے (یعنی ان کے اعمال کے بدلے ان کا ٹھکانہ جہنم ہونے والا ہے) ان کے پاس عقل ہے لیکن وہ اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان ہیں مگر ان سے سننے کا کام نہیں لیتے وہ عقل و دانش کو الگ رکھ کر حیوانوں کی طرح ہو گئے۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے یہ وہ لوگ ہیں جو (دنیا و مافیہا سے) ... بے خبر زندگی بسر کرتے ہیں۔

لیکن وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتاتا ہے کہ چونکہ عقل کا فطری منصب، تحفظ ذات (Preservation of Self) ہے۔ یعنی اس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اس فرد کی طبیعی زندگی کو محفوظ رکھے جس کی وہ پاسبان ہے۔ اس لئے جس وقت مختلف افراد کے مفاد میں ٹکراؤ ہوگا۔ (اور ایسا تصادم، اجتماعی زندگی میں قدم قدم پر ہوتا ہے) اس وقت ان افراد کی عقول کی باہمی جنگ لازمی ہے۔ اسی کو (Battle of wits) کہتے ہیں۔ یعنی عقل انسانی، صرف افراد کے حقوق کا تحفظ چاہتی ہے۔ انسانیت کے مفاد کلی کا تحفظ اس کے حیطۂ فرائض سے باہر ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ افراد کی عقل کو ایسی حدود کے اندر رکھا جائے جس سے وہ انسانیت کے مفاد کلی کے لئے ضرر رساں نہ ہو سکے۔ ان ہی حدود کا نام وہ اصولی قوانین ہیں جو قرآن نے انسانی زندگی کی راہ نمائی کے لئے متعین کئے ہیں۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے عقل انسانی کو پوری آزادی حاصل ہے کہ وہ تسخیر کائنات میں اپنی تمام قوتیں صرف کردے۔ یہ ہے "عقل اور مذہب" میں وہ تطبیق و موافقت جسے قرآن نے پیدا کیا۔ اس کے نزدیک عقل آنکھ ہے اور قرآنی اصول، سورج کی روشنی۔ نہ آنکھ روشنی کے بغیر اپنا فریضہ سر انجام دے سکتی ہے اور نہ روشنی آنکھ کے بغیر کسی مصرف کی ہے۔ عقل کو الگ کر کے انسانوں کی دنیا چھوڑ دیں تو یہ کامیدان بن جائے گی۔ لیکن عقل کو بیباک چھوڑ کر، یہ دنیا، درندوں کے بھٹ میں تبدیل ہو جائیگی۔ عقل و فکر سے کام نہ لینے والے، قرآن کے نزدیک انسانی زندگی کی سطح سے بہت نیچے ہیں۔ لیکن

عقل سرکش اور علم بیباک کا نام انکی زبان میں ابلیسیت اور شیطانیت[1] ہے۔ عقل، جب ان ابدی اصولوں کی رفاقت میں کام کرتی ہے جن پر انسان کی فطرت صحیحہ کی بنیاد ہے تو اس سے یہ دنیا اس جنت میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کی تلاش میں آدم اتنے عرصہ سے مارا مارا پھر رہا ہے۔ اسلامی نظام عقل اور ابدی اصولوں میں یہی رفاقت و تعاون پیدا کرتا ہے۔ ملائیت (Preest hood) کی ایمونیت عقل کو سلب کرتی ہے اور ملوکیت کا استبداد، ان ابدی اصولوں کی جگہ، انسان کے خود ساختہ قوانین کی اطاعت کراتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں فطرت انسانی کے خلاف اور شرف انسانیت کی تنقیص ہیں۔ ان کے برعکس اسلامی نظام حکومت عقل کو اجاگر کرتا ہے اور اسے اس نور مبین (کھلی کھلی روشنی) میں چلاتا ہے جو اسکی راہ نمائی کے لئے قرآنی آفتاب کی کرنوں سے پیدا ہوتی ہے۔ ان دونوں کے امتزاج، بلکہ رفاقت سے شرف انسانیت ملبندے بلند تر ہوتا ہوا زمین کی پستیوں سے آسمان کی رفعتوں کی طرف ابھرتا چلا جاتا ہے۔ یہ ہیں اسلامی نظام کے صحیح نتائج۔

لیکن اس حقیقت کو بھی یاد رکھئے کہ کوئی نظام اپنے صحیح نتائج پیدا نہیں کر سکتا جب تک اسے چلانے والے اپنے اندر تبدیلیاں نہ پیدا کریں۔ باہر کی دنیا کا انقلاب، اندر کی دنیا کے انقلاب کا عکس ہوا کرتا ہے۔ قرآنی نظام میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ دل کی دنیا میں تبدیلیاں پیدا کر دیتا ہے۔ اور پھر یہی تبدیلیاں اس نظام کو بطریق احسن چلائے جاتی ہیں اس طرح ایک ایسا دائرہ (cyclic order) قائم ہو جاتا ہے جو خود اپنے زور دروں (Momentum) سے متحرک رہتا ہے۔ یہ تبدیلیاں کس طرح پیدا ہوتی ہیں اور اس نظام میں فرد اور جماعت کا کیا تعلق ہوتا ہے یہ چیزیں کسی دوسرے وقت عرض کروں گا۔ اس وقت صرف اتنا دیکھئے کہ جس اسلامی نظام کے لئے چاروں طرف سے پکار ہو رہی ہے وہ ہے کیا اور آج اسے مرتب کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ یہی چیز ہے جسے میں نے گذشتہ صفحات میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

---

[1] ان امور کی تفصیل معارف القرآن کی جلد دوم میں ملیگی

یروشلم

(از علامہ اسلم جیراج پوری)

یروشلم یا بیت المقدس فلسطین میں ہے جو ملک شام کا جنوبی حصہ اور بحیرہ روم کے کنارہ پر واقع ہے۔ اس شہر کا بانی ملک صدق تھا جس کو توریت کتاب پیدائش میں سلم کا بادشاہ کہا گیا ہے۔ ملک صدق کے سو سال بعد یبوسی قوم نے جو کنعانی تھی اس پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت سے اس کا نام یبوسلم ہوا جو رفتہ رفتہ یروشلم بن گیا۔ یہ شہر کوہ موریہ کے اس حصہ پر ہے جو کسی قدیم بادشاہ کے نام سے صیہون بولا جاتا ہے۔ فلسطین کا تعلق حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد کے ساتھ قدیم زمانہ سے ہے۔ اس لئے تاریخ میں اس ملک کا نام یہودیہ رکھا گیا ہے۔ اور چونکہ انبیاء بنی اسرائیل کے مقامات اور آثار اس میں بہت ہیں اس وجہ سے قرآن کریم نے بھی اس کو ارض مقدس اور مبارک سرزمین کہا ہے۔

حضرت ابراہیم شاہان بابل کے عہد میں اپنے وطن سے جو بابل کے اطراف میں تھا ہجرت کر کے فلسطین میں آگئے تھے۔ ان کی اولاد کنعان میں جو یروشلم سے تیس میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں تھا آباد ہو گئی کہتے ہیں کہ اس اطراف میں وہ کنواں اب تک موجود ہے جس میں حضرت یوسفؑ کو ان کے بھائیوں نے ڈالا تھا۔

یروشلم بحیرہ روم سے ۳۲ میل کے فاصلہ پر سطح سمندر سے ڈھائی ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہاں سے دریائے اردن جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصطباغ لینے کی روایت بیان کی جاتی ہے ۲۰ میل ہے۔ اس دریا کی زیارت کیلئے ہر سال ہزاروں بلکہ لاکھوں عیسائی آتے ہیں اور اس کا پانی بطور تبرک لیجاتے ہیں۔ شہر ناصرہ جہاں حضرت عیسیٰؑ آکر رہے تھے جس کی نسبت سے ان کی امت نصاریٰ کہلاتی ہے ستر میل ہے۔ بیت لحم جو حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش گاہ ہے چار میل پر ہے۔ اور مکفیلہ کے غار جہاں بڑے بڑے انبیا حضرت ابراہیم۔ اسحاق۔ یعقوب۔ اور یوسف علیہم السلام کے مزارات ہیں۔

۲۰ میل پر ہیں۔ اب اس مقام پر اچھا خاصا شہر آباد ہو گیا ہے جس کو خلیل کہتے ہیں۔

یہ معلوم رہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے باپ حضرت یعقوبؑ اور ان کی اولاد کو جو ۹۲ نفوس پر مشتمل تھی اپنی وزارت کے زمانہ میں کنعان سے مصر بلا لیا تھا اور عین شمس کی زرخیز زمینوں میں ان کو آباد کر دیا تھا۔ مصر میں داخل ہونے کے سولہ سال بعد حضرت یعقوبؑ نے انتقال فرمایا۔ حضرت یوسفؑ خود ان کے جنازہ کے ساتھ اپنے آبائی قبرستان میں آئے اور حضرت ابراہیمؑ و اسحاقؑ کے پہلو میں ان کو دفن کر کے واپس گئے۔ دوسرے سال حضرت یوسفؑ نے وفات پائی۔ ان کی نعش تابوت میں مصر ہی میں رکھی گئی۔ مگر وہ اپنے وارثوں کو وصیت کر گئے تھے کہ جب تم کو موقع ملے اس تابوت کو میرے آبائی مقبرہ میں پہنچا دینا۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر نکلے تو اس تابوت کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ اور حسب وصیت مکفیلہ کے گورستان میں ان کے باپ دادا کے پاس اس تابوت کو سپرد خاک کیا۔ حضرت موسےٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر اپنے ساتھ لیئے ہوئے فلسطین کی طرف آئے اور ان سے کہا کہ یہ ملک تمہاری قسمت میں لکھ دیا گیا ہے اس کو فتح کر لو۔ مگر وہ فرعونیوں کے ظلم و ستم کے کچلے ہوئے لوگ بہادری کے سارے جوہر کھو چکے تھے۔ کسی طرح جنگ کے لئے آمادہ نہ ہو سکے۔ آخر پوری قوم کو اللہ نے چالیس سال کے لئے تیہ (بن باس) میں ڈال دیا۔ تاکہ اتنے عرصہ میں پرانے لوگ گزر جائیں اور نئی نسل جو کہ بیابان کی پلی ہوئی ہو پیدا ہو جائے۔ اسی بن باس میں حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ بھی گزر گئے۔ ان کے بعد حضرت یوشعؑ نے بنی اسرائیل کے نوجوانوں کو ساتھ لے کر فلسطین کو فتح کیا۔ یروشلم کبھی بنیامین قبیلہ کے ہاتھ میں ہوتا اور کبھی یہوداکے۔ لیکن جب سے اللہ نے اس کو اپنی ہیکل (مسجد اقصیٰ) کے لئے چن لیا اس وقت سے کل شہر کی تمام زمین ہر فرقہ کی زمین ہو گئی اور کوئی اپنے گھر کو نہ کہہ سکا کہ یہ میرا گھر ہے۔ کیونکہ عید کے ایام میں سب لوگ اپنے باہر سے آنے والے بھائیوں کو بلا کرایہ مکانوں میں ٹھہراتے۔

یہاں سال میں تین بڑی عیدیں منائی جاتی ہیں جن میں یہودی مختلف مقامات سے آکر شریک ہوتے ہیں عید فصح۔ یہ فرعون کے قبضہ اور ظلم سے رہائی کی یادگار ہے۔ اس میں روزہ رکھتے۔ قربانی کرتے۔ اور فطیری روٹی کھاتے ہیں۔ بنی اسرائیل نے یہ رہائی عاشورہ کے دن یعنی دسویں محرم کو پائی تھی۔ ہماری حدیثوں میں

نصب کیا جسے اللہ نے ہمیشہ کے لئے اس کو پسند فرمایا تھا۔ اور جس کی طرف اشارہ کتاب استثناء کے بارھویں باب میں ہے۔ یعنی یروسلم میں کوہ صیہون کے اس مقام پر جہاں حضرت یعقوب نے خواب میں اللہ کے ساتھ ہمکلامی کی تھی اور نشان کا پتھر گاڑ کر اس کا نام "بیت ایل" رکھدیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یروسلم کو ایلیا بھی کہتے ہیں۔

حضرت داؤد نے اسی بیت ایل پر ہیکل (مسجد اقصےٰ) کی بنیاد ڈالی۔ اور اس کے لیے ہر قسم کا سامان مہیا کیا۔ لیکن دشمنوں کے ساتھ جنگ و جہاد کی مصروفیت کی وجہ سے ان کو اس کی تعمیر کی فرصت نہ مل سکی اس لئے وفات کے وقت اپنے بیٹے حضرت سلیمان کو اس کی تعمیر کی وصیت کر کے سارا ساز و سامان معہ ہیکل کے نقشہ کے سپرد کر دیا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے باپ کی وصیت کے مطابق اپنی تخت نشینی کے چار برس دو ماہ بعد۔ بنی اسرائیل کے خروج مصر سے پانچسو بانوے ۵۹۲ برس بعد۔ حضرت ابراہیم کے بابل سے نکل کر کنعان میں آباد ہونے کے ایک ہزار بیس برس بعد۔ طوفان نوح سے ایک ہزار چار سو چالیس برس بعد اور میلاد مسیح سے ایک ہزار آٹھ برس قبل ہیکل کی تعمیر شروع کی۔ پہلے بڑے بڑے پتھر ترشوائے اور گہری نیو کھدوا کر بنیادیں رکھیں تاکہ مدتوں قائم رہیں۔ اوپر کی عمارت سنگ مرمر کی بنوائی۔ ہیکل کا طول۔ عرض اور بلندی تینوں ساٹھ ساٹھ ذراع (ہاتھ) رکھا۔ پھر اس پر ایک بالاخانہ بنوایا۔ اس کی بلندی بھی ساٹھ ہاتھ رکھی۔ اس طرح ہیکل کی بلندی ایک سو بیس ہاتھ ہو گئی۔ پھر ہیکل کے چاروں طرف تیس چھوٹے چھوٹے حجرے بنوائے گئے جن میں سے ہر ایک کا طول اور عرض پانچ پانچ ہاتھ تھا۔ یہ حجرے سہ منزلہ تھے جن کی بلندی ہیکل کی بلندی سے نصف تھی۔ ہیکل کی چھت میں صنوبر، اور سرو کے شہتیر اور تختے لگائے گئے تھے جو حامہ کے جنگلوں میں تیار کئے گئے تھے۔ ان پر سونے کی چادریں مڑھی گئی تھیں اور دیواروں پر بھی جس سے تمام ہیکل روشن رہتی تھی۔ اور یہ تمام تعمیر اس مہارت اور خوبی کے ساتھ کی گئی تھی کہ کہیں جوڑ۔ یا درز کا پتہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ بالاخانہ پر چڑھنے کے لئے دیوار سے لگا ہوا زینہ بنا دیا گیا تھا۔ ہیکل کا رخ مشرق کی طرف تھا جس کے سامنے میں ہاتھ چوڑا برآمدہ تھا۔ ہیکل دو درجوں میں تقسیم تھی۔ ایک اندرونی جو چوبیس ہاتھ

طول و عرض میں ایکساں تھا۔ دوسرا بیرونی جس کا عرض چوبیس گز طول چالیس ہاتھ تھا۔ ان میں سرو کی لکڑیوں کے دروازے تھے۔ جن پر سونے کے پتر چڑھائے گئے تھے۔ ان کے آگے کتان کے باریک نیلے ارغوانی اور قرمزی رنگ کے پردے لٹکائے گئے۔ جن پر بیل بوٹے اور نقش و نگار قسم قسم کے تھے۔

اندرونی درجہ میں دو کروبی (فرشتے) سونے کے بنائے گئے تھے۔ جو پانچ پانچ ہاتھ اونچے تھے ان میں سے ہر ایک کے بازو بھی پانچ پانچ ہاتھ کے تھے۔ ایک کروبی کا بازو جنوبی دیوار تک تھا۔ دوسرے کا شمالی تک، دونوں کے بیچ میں عہد کا صندوق (تابوت سکینہ) رکھا گیا تھا۔ یہ کاریگر شام کے بادشاہ حیرام نے حضرت سلیمانؑ کی فرمائش پر بھیجے تھے۔ یہ لوگ عمارت کے ہر کام میں ہوشیار خاص کر سونے چاندی اور پیتل کے کام میں ماہر تھے۔ انہوں نے برآمدہ کے سامنے اٹھارہ اٹھارہ ہاتھ اونچے دو ستون بنائے جن کے محیط بارہ بارہ ہاتھ تھے۔ ان کے اوپر پانچ پانچ ہاتھ کے سوسن کے درخت کی تصویریں بنائیں۔ اور ایک جالی بھی جس پر کھجور اور سوسن کے پھولوں اور دو سو اناروں کی شکلیں تھیں۔ ایک حوض پیتل سے ڈھال کر نصف کرہ کی شکل میں بنایا۔ اس کے گرد بیل کی بارہ مورتیں پیتل کی تھیں۔ جن کی پشت پر یہ حوض تھا۔ اس کے پاس دس چوکونے ستون پانچ پانچ ہاتھ کے تھے جن کے درمیان بیل شیر اور عقاب کی مورتیں تھیں۔ اس بڑے حوض کے علاوہ چھوٹے دس حوض اس کے گرد بنائے گئے جن میں کاہن وضو کر کے عبادت خانہ یا قربان گاہ میں جاتے تھے۔ نیز قربانی کے جانوروں کو بھی یہاں دھوتے تھے۔ اسی طرح پیتل کی ایک قربان گاہ سوختنی قربانیوں کے لئے بنائی تھی جس کا طول اور عرض بیس بیس ہاتھ تھا۔ اس کے لئے بڑے بڑے دیگ۔ چمچے۔ دست پناہ وغیرہ بھی پیتل کے تھے۔ اور ہزاروں میزیں۔ اور شمعدانیں پیتل کی بنائیں جن میں سے ایک بہت بڑا شمعدان تھا جو دن رات ہیکل میں روشن رکھا جاتا تھا۔ ایک سونے کی میز بنائی جس پر اللہ کے نام کی روٹیاں رکھی جاتی تھیں۔ یہ ہیکل کے شمالی جانب قربان گاہ کے قریب رکھی گئی۔ قرآن مجید میں بھی ان چیزوں کا اجمالاً ذکر ہے۔

يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِن مَّحَارِيبَ وَتَمَاثِيلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَ

قُدُورٍ رَّاسِيَاتٍ

سے یروسلم رومی سلطنت کا ایک صوبہ ہو گیا جہاں روما کی طرف سے ایک والی رہا کرتا تھا اور تھوڑی سی رومی فوج بھی۔ اسی رومی تسلط کے زمانہ میں وہاں حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے۔ ۶۶ء میں یہود نے رومیوں سے بغاوت کی اور سرکشی پر کمر باندھی یہاں تک کہ رومی سپاہیوں کو بھی قتل کر ڈالا۔ عیسائی اس جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔ بلکہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی پیش گوئی کے مطابق کہ یہود پر آفت آنے والی ہے۔ شہر چھوڑ کر باہر نکل گئے۔

رومی حکام نے سرداروں کو بھیجکر یہودیوں کو فتنہ و فساد سے باز رکھنے اور راہ راست پر لانے کی بہت کوششیں کیں لیکن سب رائگاں گئیں۔ بالآخر رومی سپہ سالار طیطوس لشکر لیکر آیا۔ یروشلم میں گھس کر آگ لگا دی اور بلا امتیاز ہر چھوٹے بڑے کو قتل کیا۔ ہیکل کی بھی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اس کی زمین پر ہل چلوا دیا جس کے بعد سے وہ ویران ہو گئی اور اس کا نشان تک مٹ گیا۔

مورخوں کا بیان ہے کہ طیطوس نے لاکھوں یہودیوں کو قتل کیا اور لاکھوں کو غلام بنا کر لے گیا۔

قرآن کریم نے مسجد اقصیٰ کی ان دونوں تباہیوں کا ذکر کیا ہے جو سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں ہے

> ہم نے الکتاب (توریت) میں بنی اسرائیل کے لئے فیصلہ کر دیا تھا کہ تم روئے زمین میں دو بار فساد مچاؤ گے اور بڑی سرکشی کرو گے۔ سو جب ان میں سے پہلا وعدہ آیا تو ہم نے تمہارے اوپر اپنے ایسے بندے بھیجے جو بڑے جنگ آور تھے۔ وہ تمہارے گھروں میں گھس گئے۔ اور وہ وعدہ پورا ہو گیا۔ پھر ہم نے تم کو دشمنوں پر غلبہ عطا کیا اور اموال و اولاد دے کر تمہاری مدد کی اور تم کو بڑی تعداد والا بنا دیا۔ اگر تم نیکی کرو گے۔ تو اپنے لئے اور بدی کرو گے تو اپنے لئے۔
>
> پھر جب دوسرا وعدہ آئے گا (تو ایسے بندے بھیجیں گے) تو تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد میں گھس پڑیں جیسے پہلے گھس پڑے تھے۔ اور جس چیز پر قابو پائیں اس کو برباد کر کے چھوڑیں کچھ بعید نہیں کہ اللہ تمہارے اوپر رحم کرے۔ اور جو تم پلٹو گے تو ہم بھی پلٹیں گے۔ اور ہم نے تو جہنم کو ناشکروں کا قید خانہ بنا رکھا ہے۔"

عام طور پر علماء اسلام یعنی محدثین و مفسرین کا یہ خیال ہے کہ دونوں وعدے پورے ہو گئے۔ پہلا بابل کے بادشاہ

بخت نصر کے ہاتھوں - اور دوسرا رومی گورنر طیطوس کے۔

لیکن بعض مفسر دوسرے وعدہ کا پورا ہونا اس وقت خیال کرتے ہیں جب یہودی تمام دنیا سے سمٹ کے فلسطین میں آئیں گے - جس کا اشارہ قرآن کی اسی سورہ کے آخر سے نکلتا ہے

فاذا جاء وعد الآخرۃ جئنا بکم لفیفا

جب دوسرا وعدہ آئے گا تو ہم تم کو سمیٹ کر لائیں گے۔

وعد الآخرۃ کے معنی وہ عام مفسروں کی طرح وعدہ قیامت کے نہیں لیتے - بلکہ پہلے رکوع میں جو وعد الآخرۃ آیا ہے اسی کی تشریح اور اسی کی علامت اس کو قرار دیتے ہیں - ان کی دلیل یہ ہے کہ پہلے وعدہ کے بارے میں اللہ نے فرما دیا کہ وہ پورا ہو گیا - مگر دوسرے وعدہ کے متعلق نہیں فرمایا جس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ نزول قرآن کے بعد آیندہ زمانہ میں ہونے والا ہے۔

۶۳۶ء تک رومیوں کی حکومت یہاں رہی - اس کے بعد ۶۳۶ء میں حضرت ابوبکر خلیفہ اول کے حکم سے مسلمانوں نے ملک شام پر چڑھائی کی - اور حضرت ابوعبیدہ نے یروشلم کا محاصرہ کیا۔

گئی تو ان کے اسقف سوفرونیس نے لکھا کہ یہ شہر مقدس ہے - اگر

کیا جا سکتا ہے - اس وقت حضرت عمرؓ خلیفہ ہو چکے تھے - حـ

آپ کو وہاں جانا چاہیئے چنانچہ وہ وہاں تشریف لے گ

ہی سے معلوم تھے - اس نے شہر کے در داخ

بیت المقدس انبیاء کرام بنی اسرائیل کا مرکز

اس متبرک مقام میں ایک مسجد تعمیر کریں - حضر

مسجد اقصیٰ کی افتادہ زمین کی طرف اشارہ کیا اور

حضرت عمرؓ نے خود اس کو صاف کرنا شروع

بنیاد ڈالی گئی - پہلے اس کے گرد ایک احا

عرض ایک ہزار فٹ ہے - احاطہ کے درمیان ایا

چاروں طرف سے زینہ ہے۔ اس چبوترے کے کنارے کنارے۔ موذنوں، قاریوں اور سامانوں کے لئے حجرے ہیں بیچ میں مسجد ہے جس کو مسجد صخرہ یا مسجد عمرؓ کہتے ہیں۔ یہ صخرہ وہ متبرک پتھر ہے جس پر بیٹھ کر انبیاءِ بنی اسرائیل پیغامِ الٰہی سنایا کرتے تھے۔ اسی کے متصل ایک اور بڑا پتھر ہے جس کی نسبت مشہور ہے کہ حضرت خاتم النبیین جب معراج میں یہاں تشریف لائے تھے تو اس پر تکیہ لگا کر بیٹھے تھے۔ یہ پتھر بیچ میں سے ٹوٹا ہوا ہے۔ یہاں سے ذرا ہٹ کر ایک سبز رنگ کا پتھر ہے جس کے نیچے حضرت سلیمانؑ کی قبر بتائی جاتی ہے۔

اس مسجد کی مختلف زمانوں میں مسلمان سلاطین کے ہاتھوں ترمیم و تعمیر ہوتی رہی۔ اس کی موجودہ عمارت ترکی کے سلطان سلیمان کی بنوائی ہوئی ہے۔ گنبد نوے فٹ بلند ہے اور فرش سارا اور دیواروں کا بڑا حصہ سنگِ مرمر کا ہے یہ عمارت اس شہر میں سب سے زیادہ خوشنما اور خوبصورت ہے۔ یروشلم کی فصیل بھی اسی سلطان کی بنوائی ہوئی ہے۔ دوسری یہاں کی عمارت جو قابلِ دید ہے وہ حضرت عیسیٰؑ کی قبر کے نام سے مشہور ہے۔ یہ قیصرِ روم قسطنطین کی والدہ نے بنوائی تھی۔ یہاں دنیا کے ہر گوشہ سے عیسائی زیارت کے لئے آتے ہیں اور ہر سال تاریخ معینہ پر جمع ہو کر مسیح مصلوب کا سوانگ بناتے ان کی نعش نکالتے اور ماتم کرتے ہیں۔ لیکن مسلمان اس کو غلط سمجھتے ہیں۔ کیونکہ قرآن حضرت مسیح علیہ السلام کی مصلوبیت سے انکاری ہے۔ وہ اس کو حضرت عیسیٰ کے خائن یہودا اسخریوطی کی قبر قرار دیتے ہیں۔ جس نے یہود سے رشوت لے کر حضرت عیسیٰ کو گرفتار کرانے کی کوشش کی جس کی پاداش میں اللہ نے خود اس کے چہرہ پر حضرت عیسیٰ کی شباہت ڈالدی چنانچہ وہی گرفتار ہو کر سولی پر چڑھایا گیا۔

حضرت عمرؓ کے عہد سے فلسطین کی سرزمین اور بیت المقدس کا شہر برابر مسلمانوں کے قبضہ میں رہا۔ صرف صلیبی جنگ میں ۱۰۹۲ء سے لیکر ۱۲۹۰ء تک تقریباً دو سو سال تک یہاں یوروپین عیسائیوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ جن کے ساتھ صلاح الدین ایوبی اور ملک ظاہر بایبرس وغیرہ مسلسل لڑتے رہے۔ تا آنکہ ان کو نکا-

تابع ہو گئے۔ لیکن ان کا قبضہ عارضی تھا۔ چنانچہ ۳۲ سال کے بعد اب

پیچھے صیہونیت کا ایک ایسا تخم یہاں بو گئے جو فتنہ و فساد کا بر گ

ہے۔ چنانچہ جس وقت سے انہوں نے اس ملک کو چھوڑا ہے ی

اللہ ہی جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔

ایک اجمالی خاکہ۔ مگر یہ جنگ جو عرب اور یہود میں شروع

پنے انبیاء سابقین کی روایتوں اور پیش گوئیوں کے مطا

سمجھتے ہیں اور مسلمان اپنے نبی کی روایات کے مطابق

نہیں ہے۔

ن کو سلطنت نصیب نہ ہو گی۔ لیکن عربی سلاطین

بھادی ہیں جن کو قرآن انبیاء کے لئے بھی جائز

تا کو اس جنگ کی بھٹی میں ڈالا ہو۔

قرآن اور شاعری

[مئی کی اشاعت میں ہم نے علامہ اقبالؒ کے متعلق لکھا تھا کہ وہ "شاعر نہ تھے اور نہ ہی شاعری" ایک مومن کے شایانِ شان ہے۔ چونکہ یہ سوال پہلی مرتبہ سامنے آیا ہے اس لئے حلقۂ طلوعِ اسلام کے اکثر اربابِ ذوق نے کہا ہے کہ یہ موضوع مزید وضاحت کا محتاج ہے۔ اس ضمن میں ہماری درخواست پر، محترم پرویز صاحب نے، بکمال کرم گستری ہمیں اپنی مایۂ ناز تصنیف، معارف القرآن جلد چہارم کے مسودہ سے چند اوراق مرحمت فرمائے ہیں جن میں موضوع پیشِ نظر پر ضمناً بحث کی گئی ہے۔ اس کے لئے ہم ان کے بدل شکر گذار ہیں۔ معارف القرآن جلد چہارم کی کتابت ہو چکی ہے اور اس کی طباعت میں اب کاغذ کا انتظار حائل ہے۔ اس جلد میں صاحبِ قرآنؐ کی سیرتِ مقدسہ کو خود قرآن کے آئینہ میں وجہ فروغ اظہار کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ جناب پرویز کو اس عظیم القدر سلسلہ کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ جو اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ مدیر طلوعِ اسلام]

شاعری کیا ہے

آپ نے دیکھا ہے کہ مخالفین حضورؐ کے متعلق یہ بھی کہتے تھے کہ آپ ایک شاعر ہیں اس لئے آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ حقیقت پر مبنی نہیں اور نہ ہی اس قابل کہ اس پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ قرآن کریم نے اس کی تردید کی اور فرمایا کہ

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِيْ لَهٗ ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝
(۳۶/۶۹)

اور (دیکھو) ہم نے محمدؐ کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ ہی شاعری اس کے لئے مناسب

ہو سکتی ہے یہ (کتاب) اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ (پیام حق کی) یاد دہانی واضح قرآن ہے۔

یعنی یہ کہ آپ شاعر نہیں اس لئے کہ شاعری ایک پیغمبر کی شایانِ شان ہی نہیں۔ اس سے بظاہر مترشح ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے شعر و شاعری کی سخت مخالفت کی ہے اور اسے مسلک پیغمبری کے خلاف قرار دیا ہے۔ قرآن کی آیات سے یہ استنباط وضاحت طلب ہے۔

زبان، اظہار مدعا کا ذریعہ ہے اور نوع انسانی کے لئے بہت بڑا امتیاز۔ اس اظہار مدعا کے لئے انسانوں نے دو انداز اختیار کئے ہیں۔ ایک تو وہ جس میں روزمرہ باتیں کرتے ہیں۔ اسے نثر کہتے ہیں، دوسرے شعر۔ شعر کیا ہے؟ نثر کے الفاظ کو ایک خاص ترتیب میں رکھ دیا جاتا ہے اس اعتبار سے نثر اور نظم، الفاظ کی ترتیب کے رُو سے مختلف اسلوب ہیں۔ قرآن کریم جو زندگی کے حقائق پیش کرتا ہے ایسی نیچی سطح پر نہیں اتر سکتا کہ ان دو اسالیب بیان میں سے ایک کی ایسی مذمت کرے کہ وہ کسی بلند شخصیت کے شایان شان ہی نہ رہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جب قرآن نے یہ کہا ہے کہ شاعری رسول کے شایانِ شان نہیں تو اس سے مقصود الفاظ کی وہ خاص ترتیب نہیں جس سے شعر موزوں ہو جاتا ہے بلکہ ایک خاص نفسیاتی کیفیت ہے

شاعر کی نفسیات

جسے اس نے "شاعری" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ نفسیاتی کیفیت یا مسلک حیات کیا ہے؟ اس کی قرآن نے خود ہی دوسرے مقام پر تشریح کر دی ہے۔ قرآن کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ انسانی زندگی کا ایک خاص نصب العین ہے اور اس نصب العین کا حصول انسان کی تمام جد و جہد کا مقصود بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اس کے نزدیک سفر زندگی میں منزل کی تعیین کا نام ہے ایمان، اور اس منزل تک پہنچنے کی کوششوں کا نام اعمال صالحہ۔ یہ ایمان عمل کی زندگی اس کے نزدیک انسانیت کی زندگی ہے۔ لہٰذا ایک مومن کی زندگی اور رسول کے شایان شان اسلوب حیات۔ اس کے برعکس ایک دوسرا اسلوب زندگی ہے جس میں نہ انسان کی آنکھوں کے سامنے صحیح نصب العین ہوتا ہے نہ دل میں اس نصب العین کے حصول کی تڑپ اس کے جذبات اس کا معبود ہوتے ہیں اور ان کی تسکین اس کی زندگی کا منتہیٰ۔ یہ جذبات اس کی

ناک میں نکیل ڈالے اسے زندگی کی مختلف شاہراہوں پر ادھر ادھر لئے پھرتے ہیں۔ کبھی تصورات کی ان حسین وادیوں میں کبھی تخیلات کے اُن نگاہ فریب مناظر کی طرف۔ چونکہ زندگی کا نصب العین متعین نہیں ہوتا اس لئے آج جذبات کی رو میں کچھ کہہ رہے ہیں کل کچھ اور۔ جس قسم کا جذبہ دل میں موجزن ہوا اسی قسم کی آواز زبان پر آگئی۔ چونکہ جذبات کے اظہار کے لئے شعر کی زبان زیادہ موزوں سمجھی گئی ہے اس لئے جذبات پرستی کی اس نہج زندگی کا نام قرآن نے شاعری رکھا ہے جو ایک مومن کی زندگی کے بالکل برعکس زندگی ہے۔ یہ دو مختلف اسالیب حیات ہیں جن کا تقابل قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ ۝ أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ ۝
وَأَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ ۝ (۲۶ / ۲۲۴-۲۲۶)

اور شاعروں کی پیروی ہمیشہ گم کردہ راہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ (اے پیغمبر!) تم نے دیکھا نہیں کہ وہ (روز) ہر (نئی) وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں؛ اور یہ کہ یہ لوگ وہ باتیں کہتے ہیں جو خود کرتے نہیں ہیں؟

یعنی نہ ان کے فکر کا صحیح مرکز متعین ہے اور نہ ان کے قول اور عمل میں تطابق۔ یہ ہے نفسیات شاعرانہ وہ اسلوب حیات جس کی خصوصیت پریشانیٔ فکر و نظر، آوارگیٔ قلب و نگاہ اور فقدان عمل و کردار ہے اس کے برعکس ایک دوسرا انداز حیات ہے جس میں زندگی کا نصب العین متعین ہے اور انسان کا ہر قدم اس نصب العین کی طرف اٹھتا ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَذَكَرُوا اللَّهَ كَثِيرًا وَانْتَصَرُوا
مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا ۗ وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ ۝
(۲۶ / ۲۲۷)

لہ أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ (۲۵ / ۴۳ : ۲۵ / ۴۳)

لہ پیغمبر! تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جنہوں نے اپنے خیالات ہی کو اپنا معبود بنا لیا ہے

وہاں، سوائے ان لوگوں کے جو (پیغام حق پر) یقین لے آئے ہیں اور جنہوں نے نیک کام کئے اور اللہ کو بہت یاد کیا اور اس کے بعد کہ ان پر ظلم کیا جا چکا انھوں نے اپنی مدافعت کی (یہ لوگ ایک متعین راستہ پر چلنے والے اور گفتار و کردار میں یکساں ہوتے ہیں)، اور جن لوگوں نے (ان پر) ظلم کیا ہے وہ بہت جلد معلوم کرلیں گے کہ کس منزل کی طرف وہ پلٹ رہے ہیں۔

سورہ شعراء کی ان آیات کے دونوں حصوں کو ایک مرتبہ پھر دیکھئے ان کے درمیان جو اِلّا استثنیٰ، آیا ہے اس سے یہ مراد نہیں کہ "مسلم شعراء" ہدایت و سعادت کی راہ پر ہیں۔ اس لئے قرآن کے نزدیک محبوب و مرغوب اور "غیر مسلم شعراء" ضلالت و غوایت پر ہیں اس لئے مغضوب و مبغوض۔ مفہوم اس سے یہ ہے کہ جو لوگ اول الذکر انداز زندگی اختیار کئے ہوئے ہیں وہ غلط روش پر جا رہے ہیں۔

لیکن جو دوسرا انداز اختیار کئے ہیں وہ صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔ قرآنی انداز زندگی اختیار کرنے والا اپنے مدعا کا اظہار نظم میں بھی کرے تو جائز اور درست۔ غیر قرآنی اسلوب حیات اختیار کرنے والا اپنا مفہوم نثر میں ادا کرے تو بھی غلط۔ قرآن اسالیب زندگی سے بحث کرتا ہے نہ کہ طرق اظہار مدعا سے۔ لہٰذا قرآن نے جب شاعری کو غوایت کی راہ کہا ہے تو اس سے مفہوم وہ نفسیاتی کیفیت ہے جو انسان کو غلط روش زندگی پر لے جاتی ہے اور فکر و عمل کی دنیا میں کہیں کا نہیں رکھتی۔ یہی وہ "شاعری" ہے جو ایک مدت سے مسلمانوں کے ہر شعبۂ حیات پر مستولی ہے اور ان کی کسی کوشش اور تحریک کو بارآور نہیں ہونے دیتی۔ اگر

مسلمان شاعروں کی قوم بن چکی ہے

ان کی باتیں سنئے تو ایسا معلوم ہوگا گویا ایک سیلاب ہے امنڈتا چلا آرہا ہے جو دنیا کی ہر قوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا۔ اور جب عمل کی طرف آئیے تو یہ حالت کہ ادنیٰ سے ادنیٰ چوٹ پر بھی سجدہ ریزی کے لئے تیار۔ اجتماعات قومی میں ان کے ریزولیوشنز کے الفاظ سے ان کے عزائم کا اندازہ لگائیے تو ایسا معلوم ہوگا گویا یہ لوگ چٹے ہمالیہ کو پھاڑ دیں گے۔ کوہ سے دریا بہا دیں گے۔

اور انہیں ان کے کردار ترازو میں تولیئے تو ایک پرکاہ ثابت ہوں گے۔ جب ہوا کا ہلکا سا جھونکا اڑائے اڑائے پھرے۔ جذبات کی شعلہ مزاجی کا یہ عالم کہ ذرا سے اختلاف پر نعل بر آتش ہو جائیں گے لیکن عدم استقلال کی یہ کیفیت کہ بگولے کا سایہ تمام رقص و وجد اور جوش و خروش آن کی آن میں خاک نشین ہو جائے گا۔ یہ تو ہے دنیائے عمل و استقامت میں ان کی حالت۔ دوسری طرف پریشانیٔ فکر و نظر کا یہ عالم کہ ہر ٹولی کا قبلۂ مقصود الگ اور ہر گروہ کا کعبۂ مدعا جداگانہ۔ چار دن کے پیچھے مصروف دشت پیمائی۔ دس اس کے ساتھ مشغول صحرانوردی۔ ہر گروہ فِیْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ کی عبرتناک تصویر اور ہر جماعت يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ کا تاسف انگیز مرقع۔ اور اس طرح پوری کی پوری قوم اس "شاعری" کا عملی پیکر جس کی قرآن نے یوں مذمت کی ہے۔ لیکن بایں ہمہ یوں فریب میں مبتلا کہ یہ مذمت دوسروں کی کی گئی ہے ہماری نہیں، اس لئے کہ ہم تو اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے استثناء میں آگئے ہیں۔

خدا ایں سخت جاں را یار بادا
کہ افتاد است از بام بلندے

آیۂ زیر نظر کے آخری ٹکڑہ پر ایک مرتبہ پھر نگاہ ڈالیئے اور دیکھئے کہ وہ صاحب ایمان و عمل گروہ کو فقط باتیں بنانے والوں سے کس طرح متمیز کر کے رکھ دیتی ہے، بایں نمط کہ کسی دیکھنے والے کو ان میں امتیاز کی دشواری ہی پیش نہ آئے۔ دونوں گروہ، ایک دوسرے سے الگ کھلے کھلے اور واضح طور پر متمیز۔ اس گروہ کی خصوصیات میں فرمایا کہ

(۱) وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا

(۲) وَانْتَصَرُوْا

"اللہ کا ذکر" کس طرح کیا جاتا ہے، اس کی تفصیل، معارف القرآن جلد سوم (عنوان بنی اسرائیل) میں گذر چکی ہے۔ جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ اس سے مراد "خانقاہوں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں، سرِ بزانو، ہزار ہزار دانوں کی تسبیح پر زبان سے اللہ کا نام دہراتے رہنا اور عملاً ہر طاغوتی قوت کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر قانع رہنا نہیں بلکہ دنیا سے غیر خدائی قوتوں کے غلبہ و استیلاء کو مٹا کر اس کی جگہ حکومت خداوندی کو قائم کرنا ہے"۔ اس کی عملی تفسیر یوں ہو گی کہ دنیا میں جہاں کہیں جور و تعدی اور ظلم و ستم برپا کرنے والی سرکش قوتیں سر اٹھائیں گی، "اللہ کا ذکر" کرنے والے مجاہدین اٹھیں گے اور حق و صداقت اور عدل و انصاف کی مدافعت میں، ہتھیلیوں پر سر لئے میدانِ عمل میں نکل آئیں گے اور ان طاغوتی قوتوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیں گے۔ یہ ہے نشانی اس جماعت کی جسے قرآن نے "شاعروں کے گروہ" کے مقابلہ میں امتیازی طور پر پیش کیا ہے۔ اب آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ قرآن کی زبان میں "شاعر" کسے کہتے ہیں اور وہ کیوں اس قابل نہیں کہ اس کی اتباع کی جائے۔ مومن شاعری نہیں کرتا۔ کام کرتا ہے

ما بمیدان سر بجیب، او سر بکف

اس کی تو شان یہ ہے کہ

جانِ او پائندہ تر گردد ز موت　　　　بانگ تکبیرش بروں از حرف و صوت

پادشاہاں در قبا ہائے حریر　　　　زرد رو از سہم آں عریاں فقیر

کارِ ما وابستۂ تخمین و ظن　　　　او ہمہ کردار و کم گوید سخن:

اس لئے۔

اشس

داغہائے سینہ

تا نہ خواہی داشتن گرد داغہائے سینہ را

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

آج آزادی، حرّیت، ہجرت، جہاد، مرکزیت، اطاعت، حکومتِ الٰہیہ وغیرہ الفاظ و اصطلاحات ہر گلی کوچے میں سنائی دے رہے ہیں اور اگرچہ مضطرب نگاہیں ہنوز ان کے عملی مفہوم سے آشنا نہیں ہو سکیں لیکن کان ان کے صوتی منطوق سے لذت یاب ضرور ہو رہے ہیں، اور امید کی جا سکتی ہے کہ اگر ہماری آنے والی پود کے دل و دماغ کی تربیت صحیح خطوط پر ہو گئی تو ایک دن ان حسین و مقدس خوابوں کی تعبیر مشہود و متشکل صورت میں سامنے آجائے گی۔ لیکن آج سے ایک صدی قبل ہندوستان کے مسلمانوں کی زبان بالعموم ان الفاظ سے آشنا تک نہ تھی، اور اگر کہیں یہ حروف و نقوش، پرانی کتابوں کے صفحات پر دکھائی دیتے تھے تو ان کا کاغذی پیرہن اس حقیقت کی فریاد لئے ہوتا تھا کہ ان سے مفہوم وہ نہ لیا جائے جس کیلئے یہ الفاظ آج سے چودہ سو سال پیشتر اسلام کی حیاتِ اجتماعیہ کی لغت میں داخل کئے گئے تھے۔ آج سے ایک سو سال پہلے یہ حالت تھی کہ مسلمان ہر شعبۂ زندگی میں پستیوں کی انتہا تک پہنچ چکے تھے۔ خود سلطنتِ مغلیہ ایک چراغِ سحری کی طرح ٹمٹما رہی تھی لیکن صدیوں کی ملوکیت کے انسانیت سوز نتائج و عواقب مسلمانوں کی معاشرت میں تپ دق کے مہلک جراثیم کی طرح سرایت کر چکے تھے۔ قوم کے سامنے نہ زندگی کا کوئی واضح مقصود تھا اور نہ اس مقصود کے حصول کی کوئی تڑپ۔ بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ اس بھیڑ اور انبوہ کو قوم کے لفظ سے تعبیر کرنا اس لفظ کو یکسر غلط معنی پہنا دینا تھا۔ اس ہجوم و انبوہ کا جمود و تعطل انتہا تک پہنچ چکا تھا اور ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھتی تھی کہ مسلمان نہیں راکھ کا ڈھیر ہیں۔

لیکن رحمتِ باری کا کرشمہ دیکھئے کہ اس راکھ کے ڈھیر سے ایک ایسی چنگاری پیدا ہوئی جس نے اپنی خداداد حرارت سے تمام منجمد ماحول کو گرما دیا اور مدتوں کے بجھے ہوئے افسردہ سینوں میں ایسی تمازت پیدا کر دی جس سے دلوں میں امنگیں، نگاہوں میں روشنی، جگر میں خون، سر میں سودائے عشق اور بازوؤں میں بے پناہ قوت موجزن ہوئی۔ اس چشمۂ نور و حرارت کا نام تھا مجاہدِ اعظم، شہیدِ ملت، حضرت سید احمد بریلوی علیہ الرحمۃ۔

آسماں اسکی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

ذرا اندازہ لگائیے! ایک شخص ایک متوسط الحال گھرانے میں پیدا ہوتا ہے۔ نہ دولت و حشمت ساتھ ہے نہ ساز و یراق۔ نہ حالات مساعد ہیں نہ زمانہ سازگار۔ نہ کوئی رفیق کار ساتھ ہے نہ کوئی ہمنوا و ہم خیال شریکِ حال۔ اس کس مپرسی و بیچارگی، اس بے سر و سامانی اور ناتوانی میں ایک دُور کی آواز تھی جو اسے پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ انتم الاعلون ان کنتم مومنین۔

وہ اس آواز کو سنکر اٹھتا ہے اور چند ہی سال کی مجاہدانہ سعی و عمل اور مومنانہ تگ و تاز کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سرحد کے میدانوں میں ایک لاکھ مجاہدین کی جمعیت، ہر قسم کے ساز و سامان سے آراستہ، ہتیاروں سے مسلح، اس کے اشارہ پر خدا کی راہ میں گردنیں کٹا دینے پر آمادہ نظر آتی ہے اور اس سربکف جماعت میں کون کون سے لوگ ہیں؟ شیخ الاسلام علامہ عبدالحئی ؒ۔ حجۃ الاسلام حضرت شاہ اسمٰعیل شہید و دیگر بزرگانِ عظام و شہدائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام۔ یہ جماعت ہندوستان کے مختلف گوشوں کے سرفروش مجاہدین پر مشتمل، پنجاب سے ہوتی ہوئی سرحد تک پہنچی اور سکھوں کی بہیمیت و درندگی کے نخستان پر برقِ خاطف بنکر گری۔ جس میدان میں پہنچے اللہ کی تائید و نصرت نے بڑھ کر لبیک کہا۔ فتح پر فتح ہونے لگی۔ قریب تھا کہ مسلمانانِ ہند کی قسمت کا ستارہ پھر سے چمک اٹھے اور سرزمین سرحد آئندہ اس ضو سے جگمگا اٹھے جس کی کرنیں تمام کفرزارِ ہند کو ضیا بار کردیں۔ اگر ایسا ہو جاتا تو نہ سرزمین ہند پر انگریزوں کے قدم جم سکتے، نہ ہندو اس پر اپنا سیاسی تغلب و تسلط پیدا کر سکتا۔

اور نہ سکھوں کے وحشیانہ عزائم فرزندانِ توحید کے لئے اس طرح غارتگر متاعِ جان وآبرو ہوتے لیکن قوم کی شوریدہ بختی کا کیا علاج! عین اسوقت جب آخری فتح کے آثار قریب سے قریب دکھائی دے رہے تھے، ادھر سردارانِ سرحد نے غداری کی، ادھر دہلی سے مولوی صاحبان کا ایک گروہ اس جہادِ عظیم کے لئے روانہ کیا گیا کہ مجاہدین کی جماعت میں فتنہ وفساد کی آگ بھڑکائیں اور فقہی مسائل کی زہر آلود بحثیں چھیڑ کر ان میں تشتت وافتراق پیدا کریں۔ یہ تیر کارگر ہوا اور بالاکوٹ کے میدان میں مجاہدین کی یہ جماعت، جسے آسمان کے دیدۂ بے خواب نے ایک مدت کے انتظار کے بعد دیکھا تھا، اللہ کی راہ میں سر کٹا کر حیاتِ ابدی سے ہمکنار ہوگئی اور اس طرح ان غدارانِ دین وملت کے جرائم کی پاداش میں ہم آنے والے، ان بھیڑیوں کے سپرد ہوگئے جن کی ہوسِ خون آشامی کی تسکین ناممکن تھی اور جس کا آخری مظاہرہ (خدا کرے یہ مظاہرہ آخری ہو) مشرقی پنجاب کے جہنم زار میں ہوا۔

اس جماعتِ مجاہدین کے بقیۃ السیف یاغستان کی پہاڑیوں کی طرف نکل گئے جہاں ان کے چلتے پھرتے آثار ونقوش آج بھی ہر نگہ متجسس کے لئے وجہ نور وبصیرت ہیں۔ یہ لوگ وہاں مہاجرین کے لقب سے متعارف ہیں اور ان میں موجود ہیں جنہیں دیکھکر یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ

وہ خم، وہ شیشہ، وہ ساغر، وہ جام باقی ہے

اور انسان محو حیرت رہجاتا ہے کہ اُس تحریک کی قوت کسقدر شدید ہوگی جس کے اثرات سو سال کے بعد بھی ان حضرات کی رگوں میں اس قدر تیزی سے خونِ زندگی دوڑا رہے ہیں۔ انھیں باقیات صالحات میں ایک مردِ مجاہد جناب ابوسعید فضل الٰہی صاحب خادم (اور درحقیقت مخدوم) جمعیت عالیہ مجاہدین ہند، مہاجرین یاغستان ہیں۔ انھوں نے حال ہی (ستمبر ۱۹۳۷ء) میں ایک مضمون بعنوان "غلطیہائے عدیم المثال جہاں" بغرض مطالعہ خصوصی جلالتمآب محمد ظاہر شاہ شاہِ افغانستان والا حضرت سردار محمد ہاشم خاں صدر اعظم اور وزیر جنگ سپہ سالار سردار محمد شاہ محمود خاں، رقم فرمایا اور ایک معتمد علیہ قاصد کے ذریعے دربار کابل میں پہنچایا۔ یہ مضمون فارسی زبان میں تھا

اس کا اردو ترجمہ، ایک پمفلٹ کی شکل میں، جناب عبدالرشید بن شیخ حاجی حافظ فضل کریم صاحب وزیر آبادی نے لاہور سے بغرضِ رفاہِ عام شائع کیا ہے۔ یہ مضمون اس قابل ہے کہ اس کی اشاعت عام ہو، اس لئے کہ اس ایک مردِ مجاہد کی نگہ حقیقت بین نے اس امر کا جائزہ لیا ہے کہ مسلمانانِ ہند نے بالخصوص وہ کون کونسی اجتماعی غلطیاں کی ہیں جن کی وجہ سے انھوں نے اپنی سرفرازی و سربلندی کے نہایت عمدہ مواقع اپنے ہاتھ سے کھو دیئے اور اس طرح دنیا میں ذلیل و رسوا اور عاقبت میں خاسر و نامراد ہوئے۔ یہ محاسبۂ نفس وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے اس لئے کہ آج مبداءِ فیض کی کرم گستری سے مسلمانانِ پاکستان کو پھر ایک نادر موقع عطا ہوا ہے کہ وہ اپنی بگڑی ہوئی تقدیر کو اپنے اعمال سے سنوار لیں جس سے ان کی چھنی ہوئی عظمتیں اور لُٹی ہوئی شوکتیں پھر سے مل جائیں۔ ماضی کے غلط رویوں کا یہ محاسبہ، مستقبل کے خطرات سے بچنے کے لئے ایک بروقت انتباہ ہے، جسے طلوع اسلام بصد فخر و مباہات شائع کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہے۔ بجز کتابت کی غلطیوں کے مضمون میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا گیا۔ ہمیں اُمید ہے کہ قارئین طلوع اسلام اس سے کماحقہٗ مستفید ہوں گے۔ مضمون اگلے صفحے سے شروع ہوتا ہے۔

مرحوم کی تصنیف کردہ کتاب تاریخ یہود کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔[1]

غلطی خاندان بنی امیہ

سب سے بڑی سیاسی غلطی جو بنی اسرائیل کے بعد اس جہان میں واقع ہوئی وہ ہے جو بنی امیہ کے خاندان کے ہاتھ سے ہوئی۔ خلافت کبریٰ کا دستور جس کی بنیاد اس جہان میں آنحضرت صلعم نے اپنے دست مقدس سے نہایت ناقابل برداشت مصیبتیں اٹھانے کے بعد صحابہ کرام رضوان علیہم اجمعین کی جانبازیوں کے ذریعہ رکھی تھی وہ خاندان مذکور کے ہاتھ سے پھر شخصی حکومت کے نظام کے اندر تبدیل ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی نوع انسان جو اول روز سے شخصی حکومتوں کی مصیبتوں کے شکنجہ میں جکڑے چلے آرہے تھے اور اپنی نجات کے لئے رسول اللہ صلعم کا انتظار کر رہے تھے وہ بنی امیہ کی اس فروگذاشت کے طفیل خلافت کبریٰ کے فیض سے بے نصیب ہو گئے اور انھیں پھر اپنی مصیبتوں کے اندر گرفتار ہونا پڑا جن کے اندر وہ زمانہ بعثت سے پہلے گرفتار تھے۔ ہائے افسوس! ہائے افسوس!

غلطی افغانان لودھی

تیسری بڑی غلطی جس کا اثر سارے تمام اسلام کو عام طور پر اور ملک ہندوستان کو خاص طور پر محیط ہوا وہ ہے جس کا ارتکاب لودھی افغانوں کے ہاتھ سے ہوا۔ اس خاندان کے بعض افراد باہمی رقابت کے جذبہ سے اس قدر مغلوب الحال ہو گئے کہ انہوں نے مغل قوم کو جس کا وجود کفر اور اسلام کی دونوں حالتوں میں اسلام کے حق میں سوائے ضرر کے چنداں مفید ثابت نہ ہو سکا، اس بات کا موقع بہم پہنچایا کہ وہ ہندوستان کی سیاسیات کے اندر مداخلت کر کے مشرکین ہندو قوم کی شوکت کو از سر نو زندہ اور تازہ کرے۔ اس قوم کے اندر شہنشاہ جلال الدین اکبر کا وجود اسلام اور اہل اسلام کے حق میں ایسا زہریلا ثابت ہوا جس کا روئے زمین پر کوئی تریاق نہ ہو۔ اس بدبخت نے مذہب مقدس اسلام کی تنسیخ کا اعلان کیا اور اس کی ساری عمر ہندو قوم کے خوش رکھنے اور ان کے سیاسی اقتدار کی سربلندی میں صرف ہوئی۔ وہ روز ازل سے بدبخت اور ایسا بے نصیب تھا کہ وہ افغانوں ایسی غیور قوم کی فوق العادۃ جرأت اور بہادری سے کچھ فائدہ نہ اٹھا سکا۔ اگر وہ اس قوم کو ہاتھ میں لیتا تو

---

[1] جناب پرویز کی تصنیف معارف القرآن، جلد سوم، میں داستان بنی اسرائیل کو بڑی شرح و بسط سے بیان کیا گیا ہے۔

وہ ضرور مشرکین ہند کے سارے مقبوضات اور براعظم ایشیا کے باقی ملکوں کو فتح کرنے اور ان کے اندر اسلام کا پیغام پہنچانے میں کامیاب رہتا۔ ولیکن اس نے اس قوم کو جو بقرارِ فرمان ہ۔ لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا (مائدہ رکوع ۱۱)۱؎ جو اس کی۔ اس کی اولاد کی اور سارے اہل اسلام کی فطری دشمن تھی اسے گلے لگایا اور اس قوم کو جو حقیقت میں اس کے کام آسکتی تھی اس کو زیادہ سے زیادہ تعرضات اور نکبت میں ڈالے رکھنے کی پالیسی اختیار کی۔ ہائے بدبختی ہماری کہ اس نے ایک ایسی قوم کو جو صدہا سال سے جمود اور بے حسی کے سمندر میں غرق تھی اس کو نہ صرف بیدار کردیا بلکہ ملک ہند میں متحدہ قومیت کی بنیاد رکھ کر اسلام اور اہل اسلام کے دوبارہ ابھرنے کی امیدوں کو خاک میں ملا دیا اور مشرک قوم کو سیاسی حیات کی اس سربلندی پر پہنچا دیا کہ وہ اس لائق ہوگئی کہ تھوڑی مدت کے اندر سرزمین ہند، سندھ اور افغانستان کے اندر اسلام اور اہل اسلام کا نام و نشان مٹا کر اپنی فتوحات کا جھنڈا ہندوکش پر گاڑ سکے۔ اگر اس درمیان میں اچانک پردۂ غیب سے ایک مردِ خدا قوم افغان سے احمد شاہ ابدالی کی صورت میں رونما ہو کر مرہٹہ فتوحات کے سیلاب کو نہ روکتا۔ اور سنہ ۱۷۶۱ء میں بمقام پانی پت قوم مذکور کی ساری قوتِ عسکری کو نیست و نابود نہ کرتا تو بے شک مشرک قوم درۂ خیبر کی راہ سے تمام افغانستان پر قابض ہو کر رام راج کی اس پرانی یادگار کو تازہ کرنے میں کامیاب ہو جاتی جو ۲۷۳ تا ۲۳۲ قبل مسیح راجہ اشوک کے عہد میں تھی۔ یہ اس لئے کہ قوم مذکور ساری سلطنت مغلیہ پر تا تحامہ قبضہ کرنے کے بعد قلعہ اٹک پر رام راج کا جھنڈا گاڑ چکی تھی۔ خدا کی پناہ!

انیسویں صدی عیسوی کی عدیم المثال غلطیوں میں وہ غلطی سب سے بڑی ہے جو سردار پایندہ خاں مرحوم بارک زائی محمد زائی کی اولاد سے سرزد ہوئی۔ اس کی اولاد تین حصوں میں بٹ کر علیحدہ علیحدہ کابل، قندھار اور پشاور کے مرکزوں پر قابض اور ایک دوسرے کے برخلاف حصولِ اقتدار کے فکر میں باہمی کشت و خون کے اندر مبتلا تھی۔ ان کی اس باہمی رقابت اور دشمنی نے رنجیت سنگھ

۱؎ تو تمام نوع انسانی میں سے یہود اور مشرکین کو جماعت مومنین کا سب سے زیادہ شدید دشمن پائے گا۔

ایسے دشمنِ اسلام اور قوم افغان کے خون کے پیاسے شخص کو اس بات کا موقع بہم پہنچا یا کہ وہ بدون کسی بڑی زحمت کے ملتان، ڈیرہ جات، کشمیر، ہزارہ، پشاور، کوہاٹ، کرم، بنوں، ٹوچی (شمالی وزیرستان) وغیرہ ایسے زرخیز افغانی مقبوضات پر یکے بعد دیگرے اپنا قبضہ جمالے۔ اگر حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ اسمٰعیل شہید رح کی سرپرستی میں ہندوستان سے مجاہدین کی فوجیں درہ بولان چمن، قندھار، غزنی، کابل، جلال آباد اور درۂ خیبر کی راہ سے ہزارہا میل پیادہ پا سفر کی صعوبتیں جھیل کر دولتِ خالصہ کی فتوحات کے سامنے روکاوٹ نہ ڈالتیں تو یقیناً وہ مقصد سنہ ۱۸۲۴ء میں پورا ہو جاتا جسے قوم مرہٹہ سنہ ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں (پانی پت کے میدان پر شکست کھانے کی وجہ سے) پورا نہ کر سکی۔ جس کا تعلق راجہ اشوک کے رام راج کی مثال (۲۷۳-۲۳۲ قبل مسیح) کے تازہ کرنے سے تھا۔ حضرت سید احمد بریلوی رح نے نہ صرف یہ کام کیا کہ رنجیت سنگھ کی فتوحات کے طوفان کو روک دیا بلکہ انھوں نے اکثر مقبوضات افغانی کو جیسے پشاور، ہشت نگر، بنوں، کوہاٹ، ہزارہ وغیرہ ممالک کو دشمن اسلام کے ہاتھ سے آزاد کرا کر اس کی وہ حیثیت جو غیر مسلمین کے تصرف کی وجہ سے دارالاسلام سے دارالحرب میں بدل چکی تھی پھر سے اُسے دارالاسلام میں بدل دیا۔ اور ان اضلاع مفتوحہ کو (بجائے اپنے قبضہ میں رکھنے اور دنیا میں خود غرضی کی ایک بدترین مثال قائم کرنے کے) پھر سرداران پشاور کے حوالہ کر دیا۔ جس سے اُن کا گم شدہ سیاسی اقتدار پھر سے بحال ہو گیا۔ اگر سرداران کابل مقیم پشاور رنجیت سنگھ کے دھوکہ میں آ کر سید صاحب موصوف سے بدعہدی نہ کرتے اور آپ کے ساتھ مل کر خلافت رشدی کے زندہ کرنے میں رفاقت کا حق ادا کرتے تو یقیناً دنیا کا نقشہ بالکل موجودہ نقشہ سے دگرگوں ہوتا۔ نہ صرف ہندوستان کی زمین کفار اور مشرکین کے اقتدار کی گندگی سے پاک ہو گئی تھی بلکہ سارے ممالک براعظم میں کہیں بھی یورپین طاقتوں کا نام و نشان نہ ملتا۔ اور روئے زمین پر غلبۂ اسلام اور خلافت رشدی کا نظام (آفتاب عالمتاب) بن کر چمکتا۔ مگر پشاور کے سردار اپنے کابل کے بھائی کی رقابت سے اس قدر مغلوب الحال اور خواہان انتقام تھے کہ انہوں نے راجہ رنجیت سنگھ کے اس وعدہ پر کہ وہ ان کو فوجی مدد دے کر انھیں شاہ دلوائے گا بشرطیکہ وہ سید احمد اور مجاہدین ہند کا کانٹا اس کی راہ سے دور کر دیں۔ اس قدر فریفتہ ہو گئے کہ بلا سوچے سمجھے حضرت سید صاحب کی

ساری ہندوستانی قوت کو تہ تیغ کر دیا۔ جب یا جنگجو کو سرداران پشاور کے ذریعہ سید احمد کی روکاوٹ دور کرنے میں ہر طرح کا اطمینان حاصل ہو گیا تو اس نے فتح کابل کے تمام وعدوں کو بالائے طاق رکھدیا (اور اسی پر بس نہ کی) بلکہ وہ انھیں کان سے پکڑکر اپنے ہمراہ لاہور لے گیا۔ جہاں ۱۸۴۹ء تک یعنی خالصہ حکومت کے خاتمہ تک کابل کے (یہ بے نصیب سردار) سکھوں کی حکومت کی غلامی میں رہ کر رنجیت سنگھ اور اسکے درباریوں کی خوشامد اور چاپلوسی کی طرح طرح کی ذلیل کن مصیبتوں میں گرفتار رہے۔

جس طرح بنی اسرائیل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات سے اپنے گرے ہوئے حالات کی درستی میں کچھ فائدہ نہ اٹھایا اور اپنے ساتھ سارے جہان کو بھی اسلام کی برکتوں سے محروم رکھا۔ بعینہٖ اسی طرح ان سردارانِ افغانستان نے آنحضرت کی اولاد سے، یعنی حضرت سید احمد صاحب کی ذات بابرکات سے اپنی افتادہ حالت کی اصلاح میں کچھ فائدہ نہ اٹھایا۔ بلکہ دین اور ملت کے دشمنوں (یعنی سکھوں سے) دوستی اور یگانگت کے تعلقات پیدا کرکے اپنے تئیں اور اپنے ساتھ سارے جہان کو اسلام کی بے پایاں برکتوں سے اور خلافت رشدی کے دستور کے غیر محدود فیوض سے محروم رکھا۔ اُن کی اس سیاسی فروگذاشت پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہوگا۔

ان دکھ بھرے واقعات کی تفصیل کے لئے چاہیئے کہ مندرجہ ذیل کتابوں کا مطالعہ کیا جائے:۔

(۱) سوانح امیر دوست محمد خاں والی کابل مولفہ موہن لال کشمیری جو گورنر جنرل ہند کا میر منشی اور اس انگریزی وفد کا جو امیر مذکور کے دربار میں بھیجا گیا تھا ایک بڑا معزز رکن تھا۔

(۲) "انڈین مسلمانس" مصنفہ ڈاکٹر سر ڈبلیو ہنٹر۔

(۳) "ہسٹری آف دی سکھس" مولفہ کپتان کننگھم۔

(۴) سراج التواریخ مطبوعہ کابل جلد اول و دوم۔

(۵) سوانح احمدی مولفہ مولوی محمد جعفرؒ (جن پر ۱۸۶۴ء میں بغاوت کا جرم لگا کر اول پھانسی کا حکم بدل کر انھیں حبس دوام کی سزا میں کالے پانی بھیجا گیا۔

(۶) سیرت سید احمد بریلوی۔ مولفہ سید ابوالحسن علی ندوی۔

انیسویں صدی کی سب سے بڑی دوسری سیاسی غلطی وہ ہے جو امیر دوست محمد خاں والئ کابل کے ہاتھ سے سرزد ہوئی۔ اس اجمال کی شرح یوں ہے:۔

امیر دوست محمد خاں

۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر شاہ مغل دہلی کی سرپرستی میں انگریزوں کے خلاف انقلابی تحریک اس درجہ زور پکڑ گئی تھی کہ اگر امیر مذکور اُن دنوں اس تحریک کی تھوڑی سی حمایت کرتا تو نہ صرف ہندوستان کے اندر بلکہ سارے براعظم ایشیا اور افریقہ کے اندر کہیں بھی انگریزی اقتدار کا نام و نشان باقی نہ رہتا۔ امیر دوست محمد خاں مذکور کو اپنے سارے افغانی مقبوضات جو ہاتھ سے نکل گئے تھے واپس مل جاتے اور سارا ہندوستان پھر سے مسلمانوں کے تصرف میں آجاتا۔

ان زہرہ گداز حالات کی تفصیل کے لئے چاہیئے کہ مندرجہ ذیل چند کتابوں کا مطالعہ کیا جائے:۔

(۱) ہسٹری آف دی انڈین میوٹنی (تاریخ بغاوتِ ہند) ۱۸۵۷ء از قلم کرنیل کیئر۔

(۲) تاریخ بغاوت ہند از کرنیل ہومس۔

(۳) ہسٹری آف دی انڈین میوٹنی ۱۸۵۷ء از کرنل جی، بی میلسن۔

(۴) سوانح امیر عبدالرحمٰن خاں بادشاہِ افغانستان از مولوی محبوب عالم لاہور۔ ان انگریز مورخین کی تحریرات کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

گورنر جنرل ہند نے ان فوجی اور ملکی انگریز منصبداروں کو جو صوبہ سرحد پشاور کے مختلف اضلاع میں متعین تھے لکھا کہ صوبہ سرحد (پشاور) امیر دوست محمد خاں کو واپس دیدو اور خود اپنی ساری قوت کو ہمراہ لے کر مرکز دہلی کو جسے باغیوں نے محصور کر رکھا ہے چھڑاؤ۔ اس پر ایڈورڈس جیمس، نکلسن، ایبٹ، اور دوسرے انگریزی منصبداروں نے آپس میں مشورہ کرکے گورنر جنرل کے اس حکم کو مسترد کر دیا۔ اور اُسے لکھا کہ صوبۂ سرحد کی مثال اس لنگر کی سی ہے جو برطانوی حکومت کے جہاز کو ہندوستان کے اندر مضبوط اور پائدار بنائے ہوئے ہے۔ اگر اس لنگر کو ہم ہاتھ سے چھوڑ دیں تو یہ یقینی بات ہے کہ برطانوی حکومت کا جہاز چشم زدن میں غرق ہو جائے گا۔ مذکورہ بالا انگریز منصبداروں نے امیر دوست محمد خاں کو درۂ خیبر میں بلایا جہاں انہوں نے ایک بہت بڑی رقم دے کر امیر صاحب کے قلم سے دوستی اور غیر جانبداری کے معاہدہ کی تصدیق

کرائی۔ اس موقع پر امیرِ موصوف نے اس بارے میں نہ اپنی لائق اولاد کی صلاح کی پروا کی اور نہ ہی ارکینِ دولت اور ملّت کے نمایندوں کی سنی۔ یہاں تک کہ قبائلِ آزاد کے اس وفد کے مشوروں کی بھی پرواہ نہ کی جو جمعیتِ عالیہ مجاہدین ہند کی طرف سے مولانا نور اللہ خاں مرحوم کی سرپرستی میں دربارِ کابل میں اس بارے میں بھیجا گیا تھا۔

مذکورہ بالا انگریز مورخین کا کہنا ہے کہ انگریزوں کی حالت اُن دنوں اس قدر کمزور اور نازک ہو چکی تھی کہ اگر امیر دوست محمد خاں اس وقت ہماری سرکار کے برخلاف جہاد کا جھنڈا بلند کر دیتا تو بے شک جس طرح بگرمی کے بیج ایک دوسرے کے بعد نکلتے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کے سارے صوبے انگریزوں کے ہاتھ سے نکلتے چلے جاتے۔ اس وقت انگریزوں میں سے کسی کو زندہ بمبئی کے ساحل تک پہنچنا نصیب نہ ہوتا۔ وہ بڑا ہی خوش قسمت ہوتا جسے وہاں سے بذریعہ جہاز انگلستان کی بندرگاہ کو دوبارہ دیکھنا نصیب ہوتا۔

بیسویں صدی عیسوی کی سب سے بڑی سیاسی غلطی وہ ہے جو گذشتہ جنگِ عظیم ۱۹۱۴ – ۱۹۱۸ء کے دوران میں امیر شہید حبیب اللہ خاں مرحوم شاہ افغانستان کے ہاتھ سے ہوئی۔ ان دنوں برطانوی اقتدار کی کشتی جرمنوں کے ہاتھ سے ہلاکت اور فنا کے بھنور میں اسطرح بے ڈھب پھنس چکی تھی کہ امیر مذکور جہاد کا جھنڈا بلند کرنے میں ذرا بھی توجہ کرتا تو انگریزوں کے لئے یہ بات بالکل ناممکن تھی کہ وہ کچھ زیادہ مدت تک ہندوستان کی حکومت اپنے ہاتھ میں رکھ سکتے۔ ملک ہند بھی برطانوی گرفت سے رہا ہو جاتا۔ اور افغانستان صوبۂ سرحد، پشاور اور کشمیر وغیرہ تمام ہاتھ سے نکلے ہوئے مقبوضات کے واپس لینے میں کامیاب ہو جاتا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ بات ہوتی کہ نہ صرف خلافتِ ترکیہ معرضِ سقوط میں آتی (اور اس طرح ترکیہ کو اتحادی قوتیں باہم تقسیم کرنے کا موقع پاتیں) بلکہ روئے زمین کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔ جس کے اندر کہیں بھی اشتراکیت اور یورپ کی موجودہ سرمایہ داری نظام کا نشان نہ ملتا۔ نہ موجوداتِ عالم میں سے کسی کا کان موجودہ تھا سالی، بدامنی اور عالمگیر جنگوں میں سے کسی چیز کی آواز سننے پاتا۔ سر ولیم بارٹن نامی جو دولتِ برطانیہ کے سیاسی مدبروں کے اندر چوٹی کا آدمی ہے اور عہدِ حاضرہ کے ممتاز ترین مورخوں کے اندر

غلطیِ امیر حبیب اللہ خاں

اس کا شمار ہوتا ہے وہ ان حالات پر ان الفاظ میں تھوڑی سی روشنی ڈالتا ہے کہ :-

"Despite the dislike of Kabul for British policy Amir Habibullah rem.ined loyal to his pledges during the War. Had h- unleashed a jihad[the] British might have been put hard to it to hold India." ؎

(Page 221- :— "India North-West Frontier" By Sir William Barton. K.C. I.E. C.S.I.) London.

شیخ الہند کی سیاسی غلطی

اسی بیسویں عیسوی صدی کی ایک اور سب سے بڑی سیاسی غلطی وہ ہے جس کا ارتکاب فردوس مکانی شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب مرحوم و مغفور سے ان کے بعض مقربین کی خود غرضانہ مشوروں کی بنا پر ہوا۔ اس اجمال کی شرح یوں ہے

ماہِ اگست ۱۹۱۴ء مطابق ماہِ رمضان ۱۳۳۲ھ انگریزوں نے جرمنی کے برخلاف جنگ کا اعلان کیا۔ اُن دنوں جمعیت عالیہ مجاہدین ہند مقیم یاغستان کے سردار مولانا حافظ عبد الکریمؒ بن مولانا ولایت علی صاحبؒ تھے۔ انہوں نے اس موقع پر ماہِ رمضان کی بالکل پرواہ نہ کی اور ایک وفد فوراً دربار کابل میں مولوی عبد الکریم قنوجی مرحوم کی سرپرستی میں روانہ کیا۔ یہ مولانا قنوجی صاحب مشہور انقلابی لیڈر مولانا برکت اللہ صاحب کے رفیق اور دونوں عربی ادب نواز صدیق حسن خاں والی بھوپال کے شاگرد تھے۔ اس وفد کا مقصد یہ تھا کہ وہ نائب السلطنت سردار نصر اللہ خاں اور قاضی القضات حاجی عبد الرزاق کے حضور میں پیش ہو کر

؎ اس کے باوجود کہ کابل، انگریزوں کی پالیسی کو پسند نہیں کرتا تھا، امیر حبیب اللہ دورانِ جنگ میں اپنے عہد و پیمان پر قائم رہا۔ اگر وہ جہاد کا علم بلند کر دیتا تو انگریزوں کے لئے ہندوستان کو اپنے قبضہ میں رکھنا مشکل ہو جاتا۔

اُسے دس لاکھ یوسف زائی اور تین لاکھ کوہ سیاہ کے آزاد قبائل کی وفاداری اور رفاقت کا یقین دلادے۔ اور اس کی ذاتِ شاہانہ سے انگریزوں کے برخلاف جہاد کے بارے میں مشورہ و اجازت طلب کرے۔ دلیکن امیرِ موصوف نے بوجہ روس اور برطانیہ کے باہمی اتحاد کے تحریک جہاد کی چنداں حوصلہ افزائی نہ فرمائی۔ جمعیتِ مجاہدین ہند کا یہ وفد ابھی دربارِ کابل سے رخصت نہ ہونے پایا تھا کہ ناگاہ ۵ نومبر ۱۹۱۴ء کو دنیا کے کان میں یہ آواز پہنچی کہ دولتِ برطانیہ نے خلیفۃ المسلمین ترکیہ کے برخلاف اعلانِ جنگ کردیا ہے اور اس کے بحیرہ قلزم کے فوجی استحکامات پر قبضہ کرلیا ہے۔ اس کے فوراً ہی بعد خلیفۃ المسلمین نے عالم اسلام کو انگریزوں کے برخلاف جہاد کی بطریق نفیرِ عام دعوت دی۔ اب حنفی فقہ شریف کی رو سے افغانستان کے بادشاہ اور اس کی رعیت کو اور قبائلِ سرحد اور ہندوستان کے مسلمانوں کو (اس دعوت کی قبولیت سے) اور جہاد کی شرکت سے کوئی چارہ نہ رہا۔ اس صورتِ حال سے شاہِ افغانستان کے لئے بہت سی نہ حل ہونے والی پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں۔ آخر کار "جنگِ زرگری" کی پالیسی اختیار کی گئی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ شاہِ افغانستان تو دولتِ برطانیہ کے اراکین کو دوستی اور غیر جانبداری کے اعلانات سے دم دلاسا دلاتا رہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ نائب السلطنت سردار نصراللہ خاں اور افغانستان کے قاضی القضاۃ حاجی عبدالرزاق خاں دونوں نہایت ہی مخفی طریقہ سے آزاد قبائل کو انگریزوں کے برخلاف جنگ و جدال برپا رکھنے میں مشغول رہیں۔ اور اگر اس درمیان میں انگریز اپنے حریف کے مقابلہ میں اس قدر گھر جائیں کہ دوبارہ اُن کے ابھرنے کی امید باقی نہ رہے تو اس وقت افغانستان علانیہ میدانِ جنگ میں کود پڑے اور آزاد قبائل کو ساتھ لیکر ہندوستان میں داخل ہوجائے۔ ورنہ غیر جانبداری کی پالیسی پر جما رہے۔

جس وقت بلقان کی ریاستوں نے انگریزوں کی انگیخت پر ترکوں کے برخلاف جنگ شروع کی تھی۔ پہلے اٹلی نے ماہِ اکتوبر ۱۹۱۱ء میں پھر ٹھیک ایک سال بعد اکتوبر ۱۹۱۲ء میں مانٹیگرو نے بلاوجہ ترکوں کے برخلاف اعلانِ جنگ کیا۔ اس وقت سے حضرت مولانا شیخ الہند رح کی طرف سے مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم جمعیتِ عالیہ مجاہدین ہند مقیم یاغستان کے صدر مرکز علاقہ بونیر میں آنا جانا رکھتے

تھے۔ اور امیر المجاہدین (مولانا عبدالکریم بن مولانا ولایت علی) کی خدمت میں جہاد اور ہندوستان کو آزاد کرانے کے متعلق مختلف تجویزیں اور تدبیریں پیش کرتے تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ حضرت مولانا شیخ الہند رح کے ارادوں سے بھی ان کو آگاہ فرماتے رہتے تھے۔ جمعیتِ عالیہ کے وفد کے سرکردہ مولانا عبدالکریم قنوجی نے جنھیں تمام حالات سے خبر تھی اور وہ حضرت شیخ الہند کے متعلق یہ بھی جانتے تھے کہ وہ ملکِ حجاز کی طرف عنقریب ہجرت کرنے والے ہیں۔ نائب السلطنت اور قاضی القضاۃ افغانستان کو مشورہ دیا کہ ہر تدبیر سے مولانا شیخ الہند موصوف کو حجاز کی طرف ہجرت کرنے سے روکیں اور انھیں آزاد قبائل میں ہر قیمت پر لانے کی کوشش کریں۔ اور انھیں اپنی طرف سے امیرِ جہاد مقرر کر کے قبائلِ سرحد کو ترغیب دیں کہ ان کی اطاعت کا حلقہ اپنی گردن میں ڈال کر جہاد کا فریضہ شرعی رنگ میں ادا کریں۔ اور یہ بھی عرض کیا کہ چونکہ ملکِ یاغستان اور افغانستان اور ترکستان وغیرہ تمام، مدرسہ دیوبند کے شاگردوں سے پٹا پڑا ہے۔ اس لئے کسی کو آپ کی اطاعت سے عذر کی جگہ باقی نہ رہے گی۔ بلکہ قبائلِ سرحد کا بچہ بچہ آپ کی اطاعت کو خوشی سے قبول کر کے فریضۂ جہاد کو بجا لائے گا۔ اور یہ بھی عرض کیا کہ سرحدِ آزاد کے لوگ ہمیشہ سے انگریزوں کے برخلاف جنگ کا مشغلہ رکھتے ہیں تو انگریزوں نے کبھی قبائل کی ان مخاصمانہ تحریکات کی بنا پر دولتِ افغانستان کو محلِ اعتراض نہیں گردانا۔ اسی طرح اب بھی وہ اسے محلِ اعتراض نہ بنا سکے گی۔ بلکہ وہ پہلے سے زیادہ افغانستان کی منت و زاری کرے گی کہ جس طرح اس سے بن سکے اور جتنا پیسہ خرچ ہو اُسے اس سرحدی جھنجھٹ سے نجات دلا دے۔ چونکہ قاضی القضاۃ حاجی عبدالرزاق خاں موصوف مدرسہ دیوبند کے شاگردوں اور اس کے ارادتمندوں میں سے تھے اور خود نائب السلطنت بھی تہ دل سے حضرت شیخ الہند کے غائبانہ عقیدتمندوں سے تھے اس لئے انھوں نے مجاہدینِ ہند کے وفد کے سرکردہ کے اس مشورہ کو قبول کیا اور اس پر مصر ہوئے کہ وہ سب کام چھوڑ چھاڑ کر حضرت مولانا ممدوح کی خدمت میں پہنچیں اور مولانا کو اپنے ہمراہ سرحدِ آزاد میں لائیں۔ اور ہماری طرف سے اور ہماری سلطنت کی طرف سے ہر قسم کی اخلاقی اور مادی، خاص کر سامانِ حرب کی امید سے اُن کی حوصلہ افزائی اور مددی کریں۔ اور اُن سے یہ بھی عرض کریں کہ بغیر

اس تدبیر کے اور کوئی تدبیر متصور نہیں ہو سکتی جو خلافتِ ترکیہ کی خدمت گذاری کا حق ادا کرنے اور اس سے جنگ کے بوجھ کو ہلکا کرنے میں مؤثر اور نتیجہ خیز ثابت ہو سکے۔ کیونکہ اگر مولانا موصوف حجاز کی طرف تشریف لے جائیں گے تو وہاں وہ صرف تنہائی میں بیٹھ کر (ترکوں کے حق میں فتح و نصرت کی دعا گوئی کے سوا کوئی مفید خدمت انجام نہ دے سکیں گے) اور اگر وہ سرحد آزاد میں تشریف لائیں تو کوہِ سیاہ سے لے کر وزیرستان تک یاغستان کے سب قبیلوں کی مدد سے ہندوستان کی ساری شمال مغربی سرحد پار انگریزوں کے برخلاف جنگ و جلال کی ایسی آگ بھڑکا سکتے ہیں جس کے فرد کرنے کے لئے انگریزی حکومت کو مجبوراً کم از کم چھ ڈویژن فوج ترکی محاذ سے ہٹا کر ہندوستان کی سرحد پر متقرر کرنی پڑے گی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ حضرت مولانا سے یہ بھی عرض کیا جائے کہ اگر ہماری تدبیر اُنکے نزدیک قبول کرنے کے لائق نہ ہو تو اُن کو چاہیئے کہ پھر بھی حجاز نہ جائیں بلکہ ہندوستان کے اندر رہکر مسلمانوں کو ہر جگہ اور ہر مقام پر انگریزوں کے برخلاف بغاوت اور ہنگامہ آرائی پر آمادہ کریں۔ ولیکن مولانا موصوف مولانا عبید اللہ سندھی کے یا کسی دوسرے شخص کے آخر میں آکر افغانستان کی اس دعوت کو قبولیت کے کانوں سے نہ سُن سکے۔ پھر یہی پیغام مزید تاکیدات کے ساتھ حافظ شریف احمد نیپالی کے ذریعہ مولانا ممدوح کی خدمت میں بھیجا گیا۔ یہ قاصد خود اور اس کا باپ غازی عبد الکریم نامی، جو مشہور دیوان گلشنِ ہدایت کا مصنف گذرا ہے، دونوں باپ بیٹا جمعیتِ عالیہ مجاہدینِ ہند مقیم یاغستان کے ممتاز اراکین میں سے تھے۔ مگر اب کی مرتبہ بھی ناکامی ہوئی۔ اُن کی مجلسِ شوریٰ کے بعض اراکین نے جیسا کہ چاہیئے تھا۔ اس افغانی تجویز کی تائید نہ کی اور اس مشورہ کا باعث بنے کہ وہ حجاز ہی کی طرف ہجرت کریں۔ آخری مرتبہ یہی پیغام فضل الٰہی وزیر آبادی کی معرفت جو اُن دنوں سرزمینِ ہند میں حضرت سید احمد بریلوی کی مقدس تحریک کے ذمہ دار اراکین اور جمعیتِ عالیہ مجاہدینِ ہند مقیم یاغستان کی انصاریت کے فرائض بجا لانے پر مامور تھے، مولانا موصوف کی خدمت میں پہنچایا گیا۔ ولیکن وہ آخر وقت تک اس دعوت کے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے اور حجاز کی طرف چل دیئے۔ اس دعوتِ حقہ کے انکار کا وہی نتیجہ نکلا جس کی اُن لوگوں کو توقع تھی جو مذکورہ بالا حالات سے باخبر تھے۔ حضرت ممدوح انگریزوں کے ہاتھ میں دے دیئے گئے۔ مقام جدہ میں اُنہوں نے

ایک خواب دیکھا جو حقیقت میں افغانستان کی اس دعوتِ حق سے انکار کرنے سے آئندہ چل کر اسلام اور مسلمانانِ ہند کے حق میں جو نتائج پیدا ہونے والے تھے اُن کی وہ ایک مثالی تصویر تھی۔ مگر اس خواب کا مفہوم دُوسرا سمجھا گیا۔ یعنی ترکوں کی شکست۔ اگرچہ آپ نے اس کی تعبیر بیان نہیں کی۔ مگر مولانا حسین احمد مدنی کے نزدیک جنہوں نے اُسے آپ کے سفرنامہ مالٹا میں درج کیا ہے اس کا یہی مفہوم ہے جسے ہم نے درج کیا ہے۔ شاید مولانا مدنی موصوف کو افغانستان کی مذکورہ بالا دعوت کے حالات سے اچھی طرح خبر نہ ہوئی ہو۔ اگر وہ ہماری طرح اس خواب کے پس منظر کو جانتے ہوتے تو یقیناً اس کی وہی تعبیر کرتے جو ہم نے کی ہے۔ مولانا حسین احمد مدنی موصوف کا خلاصہ خواب یوں ہے:۔

حضرت شیخ الہند اور آپ کے سارے ساتھی آنحضرت صلعم کے جنازہ کو اپنے کندھوں پر اٹھائے لئے جا رہے ہیں۔ آپ کی نعشِ مبارک کو ایک جگہ پر رکھا گیا۔ جہاں پر مولانا موصوف آپ کی تجہیز و تدفین کی خدمت بجا لا رہے ہیں۔ (او کما قال)

اس رویہ صادقہ کے صحیح الفاظ جاننے کے لئے سفرنامہ مالٹا نامی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے جسے مولانا حسین احمد مدنی نے لکھا ہے۔ اس کتاب میں اس خواب کی تعبیر مُہمل چھوڑ دی گئی ہے۔ لیکن جو لوگ مذکورہ بالا حالات سے واقف ہیں اُن کو سو فیصدی یقین ہے کہ یہ خواب اس دعوتِ جہاد سے موافقت نہ کرنے کے نتائج کی ایک مثالی صورت ہے جو افغانستان کی طرف سے آپ کو بار بار دی گئی تھی۔ اس خواب کی تعبیر اس عاجز کے نزدیک یوں ہے:۔

مدرسہ دیوبند کے سرپرست ہندوستان میں شروع سے اس وقت تک ایسے اسلام کی امانت کے اُٹھانے والے تھے جو سیاسی اقتدار نہ ہونے کے باعث بمنزلہ اس جسم کے تھا جس کے اندر روح نہ ہو۔ اب وہی اسلام برائے نام جو اُن کی کوششوں سے اب تک ہند کے اندر جاری چلا آرہا تھا۔ وہ مولانا شیخ الہند کی اس سیاسی فروگذاشت کی بنا پر اب خاص اُن ہی کے ہاتھوں زمین کے اندر مدفون ہو کر بے نام و نشان ہونے والا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

جو کچھ مولانا ممدوح کو خواب میں دکھایا گیا تھا۔ بعینہ وہی آہستہ آہستہ ظہور میں آ رہا ہے۔ مالٹا سے واپسی کے بعد سب سے بڑی اساسی غلطی یہ ہوئی کہ بدون کسی معاہدہ شرعی کے مشرکین ہند کی قوم سے اشتراکِ عمل شروع کر دیا گیا۔ اور اس کام کا طریق یوں مقرر کیا گیا کہ کام کی ساری ذمہ داریاں ہندو قوم کے ہاتھ میں رہیں اور ہندوستان کی اس ہمہ گیر انقلابی تحریک کا نام "جہادِ آزادیٔ وطن" رکھ کر اس کا امام ایک ایسے شخص کو مقرر کیا گیا جو ہندوستان کے بتیس کروڑ مشرکوں کا پیشوا مانا گیا ہے اور اس کا نام نامی مہاتما گاندھی ہے۔ اس فروگذاشت کے مہلک نتائج میں سے ایک یہ ہے کہ وہ قوم یعنی مسلمان جو سلطان ٹیپو علیہ الرحمۃ کے وقت سے تمام انقلابی اور سیاسی تحریکوں کی زمامدار اور امام بنی چلی آ رہی تھی وہ امام کے درجہ سے گر کر ماموم اور مقتدی سے مقتدی بن گئی۔ اس کے بعد اسلام اور اہل اسلام پر مشرکینِ ہند کے ہاتھ سے جو پیش آیا، اور آ رہا ہے سب کو معلوم ہے لکھنے کی حاجت نہیں۔ اور مشرکین کی حمایت میں دارالعلوم دیوبند کے اکثر تعلقداروں اور حضرت مولانا ممدوح کے شاگردوں کے ہاتھ سے وقوع میں آیا اور آ رہا ہے وہ بھی دنیا کی آنکھ کے سامنے ہے۔ یہ سب مولانا موصوف کی اسی پہلی اساسی غلطی کا نتیجہ ہے۔ اللہ ان سے درگذر فرمائے۔ آمین۔

افغانستان کی طرف سے اگر کوئی دعوت نہ بھی ہوتی اور مولانا شیخ الہند یوں ہی اپنے طور پر آزاد قبائل کے اندر تشریف لے آتے تو سرحد کے سارے لوگ اپنی رضا و رغبت سے بلا چون و چرا آپ کی امارت پر اتفاق کر لیتے اور فریضۂ جہاد بجا لانے میں اُن سے کسی کو عذر نہ ہوتا۔ اس جنگِ عمومی کے دوران میں ایک ایسا قیمتی موقع پیدا ہوا تھا کہ اگر مولانا ممدوح ایسے ہر دلعزیز اور ذی اثر شخص کی سرپرستی اُس وقت قبائل کو حاصل ہوتی تو یقیناً ملکِ ہند برطانیہ کی گرفت سے آزاد ہو جاتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جنگ کا سارا نقشہ بدل جاتا۔ برطانیہ۔ فرانس۔ روس کا نام و نشان محو ہو جاتا۔ ترکیہ کی خلافت کا معرضِ سقوط میں آنا تو درکنار وہ یقیناً یورپ افریقہ اور ایشیا کے تمام سابقہ مقبوضات پر دوبارہ مالک بن جاتے اور ہندوستان کے مسلمان بھی اپنی گذشتہ عظمت کے حاصل کرنے میں ترکوں سے پیچھے نہ رہتے۔ اور افغانستان بھی بھرپور فائدہ اٹھاتا۔ انگریزوں کی اُس وقت کی کمزوری کا

ایک واقعہ یہاں پر درج کرنا مذکورۃ بالا بیان کی تائید کے لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ اسکی شرح یوں ہے:۔

سنہ ۱۹۱۵ء کے شروع میں سنٹرل پاورس (جرمنی۔ آسٹریا۔ ٹرکی) کی طرف سے ایک دفد کابل کی طرف روانہ ہوا تاکہ شاہِ افغانستان کو انگریزوں کے برخلاف خلیفۃ المسلمین ترکیہ کے رسوخ و اثر سے کام لے کر جنگ پر آمادہ کرے۔ انکی گرفتاری کے لئے ایک طرف سے روسی فوجیں اور دوسری طرف سے ساڑھے تین لاکھ کا ایک جرار لشکر کیل کانٹے سے پورا لیس ہو کر جرنیل ٹونشنڈ (Genl, Townshend) کی سرپرستی میں روانہ ہوا۔ انگریزی لشکر ۲۸ ستمبر سنہ ۱۹۱۵ء عراق عرب کے مشہور مورچہ قط العمارہ کے اندر ترکوں کے گھیرے میں آگیا۔ یہ محاصرہ چھ ماہ سے کچھ دن زیادہ ۲۰ اپریل سنہ ۱۹۱۶ء تک جاری رہا۔ اس درمیان میں جرنیل مذکور نے انگلستان اور ہندوستان سے امداد کے لئے بڑی کوشش کی، کہیں سے اسے مدد نہ پہنچی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آخر اُسے ناامید ہو کر معہ لشکر اور سامانِ جنگ کے ترکوں کے سامنے تسلیم ہونا پڑا، اس وقت ہندوستان کے اندر چند ہزار سے زیادہ لشکر باقی نہ رہا تھا۔ جمعیتِ عالیہ مجاہدینِ ہند کے دونوں مرکزوں (اسمس اور چمرکنڈ) کی کوشش سے دربارِ کابل کی امداد کے بغیر، سرحد یوسف زائی اور وزیرستان پر انگریزوں کے برخلاف جنگ شروع ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنوبی وزیرستان انگریزی اثر سے بالکل پاک ہو گیا۔ وہاں سے ان کا ایک بچہ بھی بقیدِ حیات نہ نکل سکا۔ یوسف زائی کے محاذ پر ان کی جو گت بنی وہ ناقابلِ بیان ہے۔ اگر اس تحریک کی باگ ڈور اس وقت حضرت شیخ الہند جامع صفات لیڈر کے ہاتھ میں ہوتی۔ جن کی ذاتِ بابرکات کو افغانستان اور یاغستان کے اندر کسی طرح سے بھی وہابی اور لامذہبیت کے الزام سے بدنام نہ کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ یہ ملک مدرسہ دیوبند کے شاگردوں اور ارادتمندوں سے پٹے پڑے ہیں، تو یہ تحریک اتنی مدت تک زندہ رکھی جا سکتی تھی کہ ہندوستان سے انگریزی اقتدار کا بزورِ شمشیر خاتمہ ہو سکتا۔

اسی عہد کی تیسری عدیم المثال سیاسی غلطی وہ ہے جس کا ارتکاب انھیں ایام میں عربوں سے ہوا۔

وہ کرنیل لارنس وغیرہ اخوان الشیاطین کے اِغواسے ترکوں کے دشمنوں سے مل گئے اور ان کے سلئے نہ حل ہونے والی پیچیدگیاں پیدا کردیں۔ اس غلطی کو افغانستان کی غلطی سے اس لئے سنگین تر قرار دیا جاسکتا ہے کہ افغانستان نے آخر وقت تک غیر جانبدار رہ کر ترکوں کو اور عالمِ اسلام کو نقصان پہنچایا۔ اس کے برخلاف عربوں نے انگریزوں کے ساتھ شریکِ جنگ ہوکر اپنے آپ کو۔ عالمِ اسلام اور سارے جہان کو ایسا نقصان پہنچایا جس کا سلسلہ ختم ہونے پر آتا ہی نہیں بلکہ روز بروز بڑھتا ہی چلا جارہا ہے۔

مسلمانانِ ہند کی چوتھی غلطی

اِسی بیسویں صدی کی سب سے بڑی اور عدیم المثال سیاسی غلطیوں میں چوتھی غلطی وہ ہے جس کا ارتکاب مسلمانانِ ہند کی بہت سی جماعتوں سے ہوا۔ وہ یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ ہادی برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی راہ نمائی کو قبول کرکے آپ کے فرمان وَھُمْ یَدٌ عَلٰی مَنْ سِوَاھُمْ [صلعم] (رواہ ابوداؤد عن علی رض کذا فی المشکوٰۃ کتاب القصاص) کے ماتحت غیر مسلم طاقتوں کے مقابلہ میں متحدہ محاذ پیش کرتے۔ انہوں نے علانیہ اس فرمان واجب الاذعان کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اکبر ایسے مُلحد دشمنِ اسلام اور اس کے چیلے گاندھی ایسے راس المشرکین کے نظریہ کی یعنی "متحدہ قومیتِ ہند" کی وہ پرجوش حمایت کی جو خود قومِ ہنود بھی نہ کرسکی ہوگی۔ اُن کے اس طرزِ عمل سے مسلمانانِ ہند کے ملی وقار کو وہ صدمہ پہنچا جس کی وہ اور ان کی اولادیں شاید قیامت کے دن تک تلافی نہ کرسکیں آج بنگال۔ آسام اور پنجاب کا جتنا حصہ اور ان کے اندر کی قیمتی معدنیات اور قدرت کے دوسرے لازوال خزانے جو مسلمانوں کے ہاتھ سے چلے گئے۔ اور وہ ہر جگہ مشرکین کے ہاتھ سے گاجر مولی کی طرح پائمال کئے جارہے ہیں یہ سب اُن کی نافرمانی کا نتیجہ ہے جو انہوں نے مذکورہ بالا ارشادِ نبوی صلعم کو نہ سنتے ہوئے عین اس کی ضد پر تحریک متحدہ قومیتِ ہند کی حمایت میں اپنے سارے قوائے ذہنی اور مادی کو وقف کئے رکھا۔ جیسے زہر کھاکر زندہ رہنا محال سمجھا جاتا ہے ویسے ہی

صلعم میری امت، تمام غیر مسلم عناصر کے مقابلہ میں ایک ہاتھ کی مانند ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورۂ بالا فرمان (وَھُمْ یَدٌ عَلٰی مَنْ سِوَاھُمْ۔ میری اُمّت تمام غیر مسلم عناصر کے مقابلہ میں بمنزلہ ایک ہاتھ کے ہے) کی مخالفت کر کے کسی قوم کے سیاسی اقتدار کا فنا اور ہلاکت کلی سے بچ نکلنا محال ہے۔

انگریزوں کے سامنے جرمنی۔ اٹلی۔ جاپان۔ ترک ایسی شجاع ترین اور منظم دولتیں قائم نہ رہ سکیں۔ مگر قبائل آزاد کو جن پر، بقول آصف علی چار ارب روپیہ برطانیہ کا خرچ ہوا۔ اکانوں برس کی متواتر خونریزیوں کے باوجود مطیع نہ بنا سکی حالانکہ وہ دنیا کی مفلس ترین قوم اور باہم لڑتے رہتے ہیں۔ پھر بھی وہ انگریزوں کے مقابلہ میں پورے اُترتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کا راز فقط ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ جب برطانیہ اُن پر حملہ آور ہوتی رہی۔ وہ باہمی قتل وقتال کو چھوڑ کر فوراً اس کے مقابلہ میں بقرارِ فرمان (وَھُمْ یَدٌ عَلٰی مَنْ سِوَاھُمْ) ایک دل اور ایک جان ہو جاتے ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار ط۔

غلطی افغانستان و قبائل آزاد

زمانہ حاضرہ کی مُہلک ترین اور عدیم المثال پانچویں سیاسی غلطی وہ ہے جس کا ارتکاب دولتِ افغانستان اور بعض آزاد قبائل خصوصاً توری خیل۔ مداخیل، وزیرستان کی جانب سے بصورتِ "تحریک پٹھانستان" ہوا ہے۔ اور افغانستان نے بھی پر زور اس کی حمایت کی ہے۔ برطانیہ کے عہد میں چونکہ اس قسم کی تحریک اسلام کے اجتماعی مقاصد کی موید تھی مبارک سمجھی جا سکتی تھی۔ مگر جب صوبہ سرحد پشاور پنجاب بلوچستان سندھ وغیرہ برطانیہ کے ہاتھ سے نکل کر دارالحرب سے دارالاسلام بن گئے ہیں۔ اس صورت میں پٹھانستان کی تحریک سے پاکستان کا وجود کمزور اور فنا ہو جائے۔ تو افغانستان اور قبائل آزاد مشرکین ہند کی غیر محدود حربی قوت کے سیلاب کے سامنے ایک دن زندہ نہیں رہ سکتے۔ بلکہ خس وخاشاک کی طرح اس کی موجوں کے تھپیڑوں سے اس طرح بہ کر فنا ہو جائیں گے کہ براعظم ایشیا میں ان کا نام ونشان نہ ملے گا۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح ہندو قوم نے اپنے ساٹھ سالہ وعدوں کو پس پشت ڈال کر مسلمانوں کا بنگال، بہار،

یوپی ۔ بمبئی ۔ مشرقی پنجاب اور پنجاب کی ریاستوں کے اندر قتل عام جاری کر رکھا ہے ۔ لاکھوں مارے گئے ۔ لاکھوں ہی جلاوطن کئے گئے ۔ ارب ہا روپیہ کی جائداد پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ۔ سوائے اسلام کا علمبردار ہونے کے ان کا کوئی قصور نہیں تھا ۔ جس کے بدلے وہ گردن زدنی ۔ سوختنی قرار دیئے جا رہے ہیں ۔ (وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَن يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ۵۱) انیسویں صدی میں افغانستان ، قبائلِ سرحد آزاد اور صوبہ سرحد پشاور پر مشرکین سکھوں کے ہاتھ سے ظلم کے جو پہاڑ توڑے گئے تھے کیا وہ اُن کی عبرت پذیری کے لئے کافی نہیں ؟ کیا جو کچھ ہندوستان ، مشرقی پنجاب اور پنجاب کی سکھ اور ہندو ریاستوں میں مشرکین کے ہاتھ سے مسلمانوں کی گت بن رہی ہے وہ اس سے سبق حاصل کرنے کا مادہ نہیں رکھتے ؟ خدا کا فرمان :- ان یثقفوکم یکونوا لکم اعداء و یبسطوا الیکم ایدیھم و السنتھم بالسوء و ودوا لو تکفرون ۵۲ (الممتحنہ پارہ ۲۸) جھوٹا نہیں ہو سکتا ۔ اگر خدانخواستہ پٹھانستان کی تحریک سے پاکستان کو کچھ بھی نقصان پہنچا ۔ اور مشرکین ہندوستھان کو سرحدی صوبہ اور افغانستان سے ضلع ہزارہ ، چلاس ۔ ریاست ہنزہ اور ریاست نگر اور چترال کی طرف سے اُن کی حدود سے ملنے کا کچھ بھی موقع ملا تو وہ مذکورۂ بالا فرمانِ خداوندی کے ماتحت صوبہ سرحد ، پشاور اور افغانستان اور قبائل آزاد کا خاتمہ کئے بغیر نہیں رہیں گے ۔ پشاور اور قبائلِ سرحد کو تو وہ رنجیت سنگھ کے قبضہ کی وجہ سے اپنی جائز وراثت سمجھتے ہیں ، اور افغانستان پر قبضہ کرنا اُن کے لئے اس لئے ضروری ہے کہ وہ راجہ اشوک سنہ ۲۷۳ تا ۲۳۲ قبل مسیح کی راج دھانی پر قابض ہو کر رام راج کی اس پرانی یادگار کو تازہ کر سکیں ۔ جس کی ان کے بزرگوں نے ان کو وصیت چھوڑی ہے اور جس کا ارمان سیواجی مرہٹہ اور اس کی اولاد اور راجہ رنجیت سنگھ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اپنے ہمراہ لے کر اس دنیا سے کوچ کئے ہیں ۔ پٹھانستان کی تحریک اس قوم کو جو از روئے تعصب اور دشمنی کے اسلام

---

۵۱ اور انہوں نے اس کے سوا کوئی جرم نہیں پایا کہ وہ خدائے عزیز و حمید پر ایمان لائے تھے ۔

۵۲ اگر ان کو تم پر دسترس ہو جائے تو فوراً تمہارے دشمن ہو جائیں گے اور تم پر زبان اور ہاتھ سے برائی پر اتر آئیں گے اور چاہیں گے کہ تم بھی کافر ہو جاؤ ۔

اور اہلِ اسلام کے حق میں روئے زمین پر اپنی مثال نہیں رکھتی۔ اور خدائے عالم الغیب نے اس کی تصدیق سورۃ النساء پارہ چھٹا۔ رکوع ۱/۱۱ میں کی ہے، دنیا کی سب سے بڑی طاقت بنادے گی۔ اس کے بعد ہندوستھان کی یہ طاقت سارے اہلِ اسلام کے حق میں اس خطرے سے بدرجہا زیادہ تباہ کن ثابت ہوگی جو چند صدیوں سے اس پر یورپین طاقتوں کی طرف سے رونما ہے۔

افغانستان کو چاہیئے کہ وہ حملوں سے بھی عبرت پکڑے جو اس پر ہندوستان کی طرف سے ۱۸۳۹ء، سنہ ۱۸۷۸ء، سنہ ۱۸۸۰ء، سنہ ۱۹۱۹ء میں ہوئے۔ یہ قبائل سرحد آزاد ہی کی دیوار تھی۔ جس نے افغانستان کو ہر بار اپنے تئیں خطرۂ عظیم میں ڈال کر بیرونی حملوں سے بچایا۔ اب یہ دیوار پاکستان کی نئی سلطنت کے بننے سے مضبوطی اور ناقابلِ عبور ہونے کے لحاظ سے کوہِ ہمالیہ سے بھی بازی لے گئی ہے۔ پاکستان نے افغانستان کو اطمینان قلبی کے اتنے بڑے ذخائر بہم پہنچائے ہیں کہ اس سے پہلے کبھی اس کو نصیب نہ ہوئے تھے۔ اب وہ ہندوستان کی طرف سے ہونے والے تمام حملوں اور تمام جنگوں سے خالی الذہن ہو کر اپنی داخلی تعمیر اور ترقی کے لئے جس قدر اس سے ہو سکتا ہے پوری دلی فراخدلی کے ساتھ کوشش کر سکتا ہے۔ چاہیئے کہ افغانستان اور قبائل سرحدِ آزاد پاکستان کو خداوند تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت اپنے حق میں سمجھ کر جس قدر اُن سے بن پڑے اس کی پائیداری اور مضبوطی میں حصہ لیں۔ اور اس کی بقا میں اپنی بقا کا راز ڈھونڈیں اور اس موقع کو غنیمت سمجھ کر جس قدر اُن کا بس چلتا ہے اپنے لئے سیاسی اور اقتصادی فوائد کے خزانے جمع کر لیں ورنہ ہمیں اندیشہ ہے کہ جس طرح ان کے اسلاف رح نے حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید رح جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولادِ پاک میں سے تھے، اُن سے مخالفت کی راہ اختیار کر کے خود اپنی جان پر اور سارے جہان پر قسم قسم کی سیاسی اور اقتصادی مشکلات کے دروازے کھولنے کا سبب بنے تھے اور انہوں نے اپنے ساتھ ساری دنیا کو اُن فیوض و برکات سے محروم کر دیا جو خلافتِ رشدی کا نظام قائم ہونے سے اُن کو ملنے والے تھے۔ انہوں نے اپنے تئیں اپنی اس سیاسی فروگذاشت سے روزِ قیامت کی سب سے بڑی سخت مسئولیت کا محل بنایا۔ اب تم لوگوں کو جو اُن کی اولاد ہو یعنی موجودہ افغانستان قبائلِ سرحدِ آزاد

اور صوبہ سرحد پشاور کو ہرگز مناسب نہیں ہے کہ پہلوں کی سی غلطی کرنے لگو۔ اور تمہارے مناسب حال یہ ہرگز نہیں ہے کہ تم لوگ پاکستان کی نعمت جو خداوند تعالیٰ نے (محض اپنی رحمانیت کے صدقے) تمہارے حال پر مفت بلا درخواست ارزانی فرمائی ہے۔ اس کی ناشکری کرنے لگ جاؤ۔ اور پھر اپنی غلط روی سے اپنے تئیں اللہ تعالیٰ کی ان تہدیدات کا مصداق بناؤ جو ان آیات کے اندر درج ہیں :۔ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ کُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۔ اور لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ وَلَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ[1] (سورۃ ابراہیم پارہ ۱۳ ۔ ع ۱۸/۵) کیونکہ اس قسم کے مدعیان اسلام سے جو خداوند تعالیٰ کی اس قسم کی مفت عطا شدہ نعمتوں کی ناشکری کر کے اسلام اور اہل اسلام کے اجتماعی مقاصد کو ضرر پہنچاتے ہیں۔ وہ اُن سے اس قدر خفا ہو جاتا ہے کہ شفیع المذنبین صلعم کی سفارش کو بھی جو اس کا سب سے پیارا پیغمبر ہے ان کے حق میں قبول نہیں کرتا۔ خواہ وہ ایک دفعہ نہیں بلکہ ستر دفعہ بھی سفارش کا ہاتھ اس کے دربار میں پھیلائے۔ چنانچہ خود ہی فرماتا ہے :۔

استغفر لھم او لا تستغفر لھم وان تستغفر لھم سبعین مرۃ فلن یغفر اللہ لھم (التوبہ۔ پارہ ۱۰ ع ۱۶/۱۰) اس قسم کے مجرموں کے لئے خداوند تعالیٰ کی بے پایاں رحمت کے وسیع دائرہ کے اندر قطعاً گنجائش نہیں رہتی۔

ہندو قوم کا سر دست فقط ایک ہی مقصد ہے کہ ہندوستان کے اندر جو مسلمان آباد ہیں۔ اُن کو حیلہ بہانہ بالقہر و جبر اسلام سے مرتد کر کے ان کو ہندوستان کی قدیم غیر آرین قوموں کی طرح اچھوت بنا دے اور ایک ہی وقت میں پاکستان کو دونوں طرف یعنی مشرقی پنجاب کی سکھ طاقت اور شمال مغربی پٹھانستان کے ذریعہ خانہ جنگی کی بلا میں پھنسا کر اس ذخیرہ سامان حرب کو جو اُسے ہندوستان کے بٹوارے میں ملا ہے خرچ کرا دے۔ اور جب اس کے بندوق بردار سپاہیوں کو کارتوس

---

[1] کیا تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جنھوں نے خدا کی نعمت کو ناسپاس گزاری سے بدل دیا اور اپنی قوم کو جہنم میں لے گئے جو ٹھہرنے کی بہت بری جگہ ہے۔ اگر تم شکر گذار ہو گے تو ہم اپنی نعمتیں زیادہ کر دیں گے اور اگر ناشکر گذار ہو گے تو ہمارا عذاب بڑا سخت ہوگا۔

نہ ملے تو اس وقت وہ فوراً پاکستان پر حملہ کر دے۔ بوجہ اس کے کہ پٹھانستان کے لوگ بھی ان جنگوں میں مبتلا رہ کر کارتوس کے ذخائر سے اس درمیان میں تہی دست ہو جائیں گے اور دن رات کی مشقتوں سے خوب تھکے ماندے ہو چکے ہوں گے وہ اس لائق نہ رہیں گے کہ ایک روز کے لئے بھی ہندوستان کی دائی اور اس کی گورکھا سکھ۔ راجپوت۔ مرہٹہ حملوں کی تاب لاسکیں۔ اُن کو آسانی سے فرمانبردار اور رعیت بنا کر افغانستان پر یورش کرنے کا کوئی بہانہ بنالے۔ اس پر یکبارگی حملہ کر دے اور اپنی اطاعت اور رعیت گری کا حلقہ بلا مزاحمت ڈالنے میں کامیاب ہو جائے۔ ہندو قوم اپنے بزرگوں کی اس وصیت کو جو اسے کوہ ہندوکش پر رام راج کا جھنڈا قائم کر کے راجہ اشوک کی یادگار زندہ کرنے کے متعلق دیگئی ہے پورا کرنا اپنے اوپر لازم سمجھتی ہے۔ ضرور پورا کر کے رہے گی۔ اور ان تمام مشکلات کو سر کرنا اسلئے بھی اس کو آسان ہے۔ کیونکہ حکومتِ برطانیہ کی پوری ہمدردی اور پوری عسکری قوت (اور تدابیر) اس کے شاملِ حال ہے۔ (العیاذ باللہ)

افغانستان کے اندر اگر کچھ بھی سیاسی تدبر کا مادہ ہے تو اسے ہرگز مناسب نہیں کہ وہ بین الاقوامی معاہدات پر بھروسہ کرے اُن کی مٹی جو پلید ہوئی وہ ہر شخص نے جنگِ عالمگیر سنہ ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۴ء کے دوران میں اپنی آنکھ سے دیکھ لی ہے۔ اس کو یہ بھی نہ چاہیئے کہ ہندو قوم کے بھروسہ پر پاکستان کے برخلاف کوئی قدم اٹھائے اس لئے کہ خداوند تعالیٰ کے فرمودہ :- يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا[۱] (سورۃ النساء پارہ ۵ ع ۱۸/۱۵) کے زیر مشرکین کے وعدے مکڑی کے تار سے بھی زیادہ کمزور ہوتے ہیں۔ اگر دولت ہندوستان ان کی خدمات کی پھر کچھ قدر و قیمت بھی افغانستان کو دے جو اس نے پٹھانستان کے ذریعہ اس کے لئے انجام دی ہوں گی۔ تو زیادہ سے زیادہ اس کی سیاسی حیثیت راجہ جودھپور اور میسور کے برابر مان لے تو مان لے۔ چونکہ افغانستان کی یہ غلطی عالم اسلام کے علاوہ تمام جہان کو بھی محیط اور اثر انداز ہونے والی ہے اس لئے اس کو افغانستان کی ساری گذشتہ غلطیوں سے

---

[۱] وہ ان سے وعدے کرتا ہے اور امیدیں دلاتا ہے اور شیطان کے وعدے فریب کے سوا کچھ نہیں ہوتے۔

دارالحرب بن گیا، اُسے فتح کر کے دارالاسلام بنائیں۔ اس کا روحانی فائدہ یہ ہوگا کہ تمام اچھوت اور غیر آرین قوموں کو اسلام کی نعمت سے سرفراز ہونے کی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ اور مادی فوائد کا تو کچھ حساب ہی نہیں۔ پٹرول۔ کوئلہ۔ لوہا۔ فولاد وغیرہ صدہا لازوال خزانے قدرت سے جن سے یہ ملک پٹا پڑا ہے۔ اس کا ایک بڑا حصہ ازروئے معاہدہ شرعی کے افغانستان کے ہاتھ آجائے گا اور وہ دنیا میں اول درجہ کی طاقتوں کے شمار کئے جانے کا مستحق بن جائے گا۔ اس تدبیر سے موجودہ افغانستان اپنے اسلاف رحمہم اللہ اجمعین کی گذشتہ سیاسی غلطیوں کی بھی تلافی کر سکے گا۔ اگر اس نے ہماری گذارش کو نہ مانا تو یقیناً ہندو طاقت سارے براعظم ایشیا پر چھا کر تمام اسلامی ممالک کو ہضم کر جائے گی اور تمام دنیا پر کفر، الحاد اور شرک کی تاریکیاں چھا جائیں گی اور وہ اسوقت تک دور نہ ہوں گی جب تک کہ خداوند تعالیٰ کی طرف سے کوئی ہادی مہدی اور امام برحق آل رسول سے پیدا نہ ہو۔ جس کی تصدیق کے لئے میں یہ آیت پیش کر سکتا ہوں۔[1]

لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنفَكِّينَ حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝ رَسُولٌ مِّنَ اللَّهِ يَتْلُو صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝ (پارہ ۳۰ ع ۲۳)

اب اس کی مرضی کہ شکر گذاری اور ناشکری کے دو راستوں میں جسے چاہے اختیار کرے مگر اتنا کہہ دیتے ہیں کہ ناشکری کا سودا اُسے بڑا ہی تباہ کن ثابت ہوگا۔

اس کے بعد آپ کا ایک خط بنام فقیر ایپی بھی ملاحظہ فرمائیے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

مورخہ ہفتدہم شوال ۱۳۶۶ھ

بخدمت زبدۃ السالکین عمدۃ المجاہدین مخدوم و محترم حضرت حاجی صاحب مدفیوضہ

---

[1] طلوع اسلام اس عقیدہ سے باادب اختلاف رکھتا ہے اور نہ ہی وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس آیت سے اس کی کہیں سند نکلتی ہے۔

السلام علیکم و رحمۃ اللہ - خوش آمدی - بخیر آمدی - ماندہ نباشی! آپ کا (درہ کئین میں) تشریف لانا اہل وطن کے لئے اور سارے عالم اسلام کے لئے دونوں جہان کی برکتوں کا سبب ہوا۔ دست بوسی اور ملاقات کی آورد کے بعد المرام اینکہ :-

سنہ ۱۹۳۷ء میں آپ نے اپنے عزیز شائستہ خاں محمود خیل کے ذریعہ چمرکنڈ سے مجھے بلا بھیجا۔ جب میں پورے دو مہینہ کی پیادہ پا مسافت طے کرنے اور راہ میں ہزاروں قسم کے جان کے خطروں سے آمنا سامنا کرنے کے بعد آپ کی خدمت گرامی میں پہنچا۔ تو آپ نے میری بات کو ہوش کے کانوں سے نہ سنا۔ حالانکہ ان مبارک دنوں خدائے مسبب الاسباب نے ایسے وسائل اور ذرائع مجھے بہم پہنچاتے تھے کہ اگر میرے بے غرضانہ مشوروں کو قبولیت کے کان سے سنتے تو خدا تعالیٰ کی بارگاہ سے امید تھی کہ آپ کا نام تاریخ عالم کے اندر برِ اعظم ہندوستان کی فتح کے لحاظ سے بمنزلہ شیر شاہ سوری کے اور تبلیغ اسلام کے اعتبار سے محمود ثانی غزنوی کے طور ثبت ہوتا اور اسلام کا غلبہ آفتاب عالمتاب کی طرح ہر جگہ چمکتا دکھائی دیتا اور دنیا بھر کے لوگوں کو قیامت کے دن تک آپ کی احسان مندی سے سبکدوش ہونے کا کوئی راستہ نہ ملتا۔ اور خدا کی ساری مخلوق میں سے کوئی شخص آپ کے نام کے سوا کسی دوسرے کے نام سے جیسے کہ گاندھی۔ نہرو اور جناح ہیں آشنا نہ ہونے پاتا۔ ولیکن آپ نے میری دشمنی اور اپنے تئیں دونوں جہان کی سعادتِ عظمیٰ سے محروم رکھا۔ اور اپنے ساتھ اس سے ایک جہان کو محروم کروایا۔

آج پورے دس برس کے بعد آپ کے بڑے بھائی مولانا شیر زماں خاں مرحوم کی تعزیت کا فریضہ ادا کرنے کے ذیل میں ملّت اسلام کی خدمت کے بلند پایہ عزائم کو لے کر آپ کی خدمت میں پھر حاضر ہوا۔ تاکہ باہمی بصلاح مشورہ اور اشتراکِ عمل سے کوئی ایسی راہ تجویز کر سکیں جو ہمارے نزدیک نہایت کمزور اور ضعیف بھائی بہنوں اور بچوں کی نجات کا سبب بن سکے جو ان دنوں مشرک قوم (سکھ۔ گورکھا۔ راجپوت۔ جاٹ وغیرہ) کے ہاتھ سے مشرقی پنجاب اور ہندوستان کے اندر طرح طرح کے ننگ آور اور حیا سوز مصیبتوں میں

گرفتار ہیں۔ اور قرآن مجید کی روشنی میں اس وقت کا سب سے بڑا جہاد یہی ہے چنانچہ فرمایا:۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ
وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ
الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ
نَصِيرًا ﴿سورۃ النساء پارہ ۵ ع ۷/۱۰﴾ ۵۱

ولیکن آپ نے (اس بار) بھی مجھ ایسے دونوں جہان کے خیر خواہ بے غرض دوست کی بات نہ سُنی۔ (بات سننا تو در کنار رہا) بلکہ ملاقات کا دروازہ بھی بند کر دیا۔

ولیکن آپ کے اس سلوک اور رفتار سے آزردہ دل نہیں ہوا۔ بلکہ زیر منطوق لازم الوثوق ہے۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۵۲

(التوبہ۔ پارہ ۱۱۔ ع ۱۶/۵) ان سب چیزوں کو اپنے حق میں خدائے لایزال بے پایاں نوازشات کے تمغے سمجھ کر بدستور سابق آپ کے لئے ہمیشہ دعا کرتا رہتا ہوں۔ ہر طرح سے خاطر خواہ جمع رہیں۔

خدائے عالم الغیب کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ میری ملاقات سے انکار کرنے کا کیا نتیجہ نکلنے والا ہے، مگر قرائن و آثار شہادت دیتے ہیں کہ آپ نے جو سیاسی مسلک اختیار کیا ہے۔ سراسر زیر فرمان ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ
إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ۵۳ (سورہ ابراہیم۔ پارہ ۱۳ ع ۵/۱۷ اور ۲/۱۴)

خدا کی نعمت کی بڑی ناشکری ہے جس کا نتیجہ اہل اسلام کی تباہی و بربادی اور دونوں جہان کی برکتوں سے محروم رہنے کے سوا کچھ نکلنے والا نہیں ہے۔ خدا کی پناہ!

آپ میری بات کو غور سے سننے کی تکلیف گوارا فرمائیں کہ سلطنت خداداد پاکستان ان دونوں کے

---

۵۱ ترجمہ پہلے گذر چکا ہے۔

۵۲ ترجمہ پہلے گذر چکا ہے۔

۵۳ یہ اس لئے کہ مجاہدین کو اللہ کی راہ میں جو پیاس لگی یا بھوک لگی یا واماندگی ہوئی .... ان سب کے بدلے میں ان کے نام پر عمل صالح لکھا جاتا ہے۔